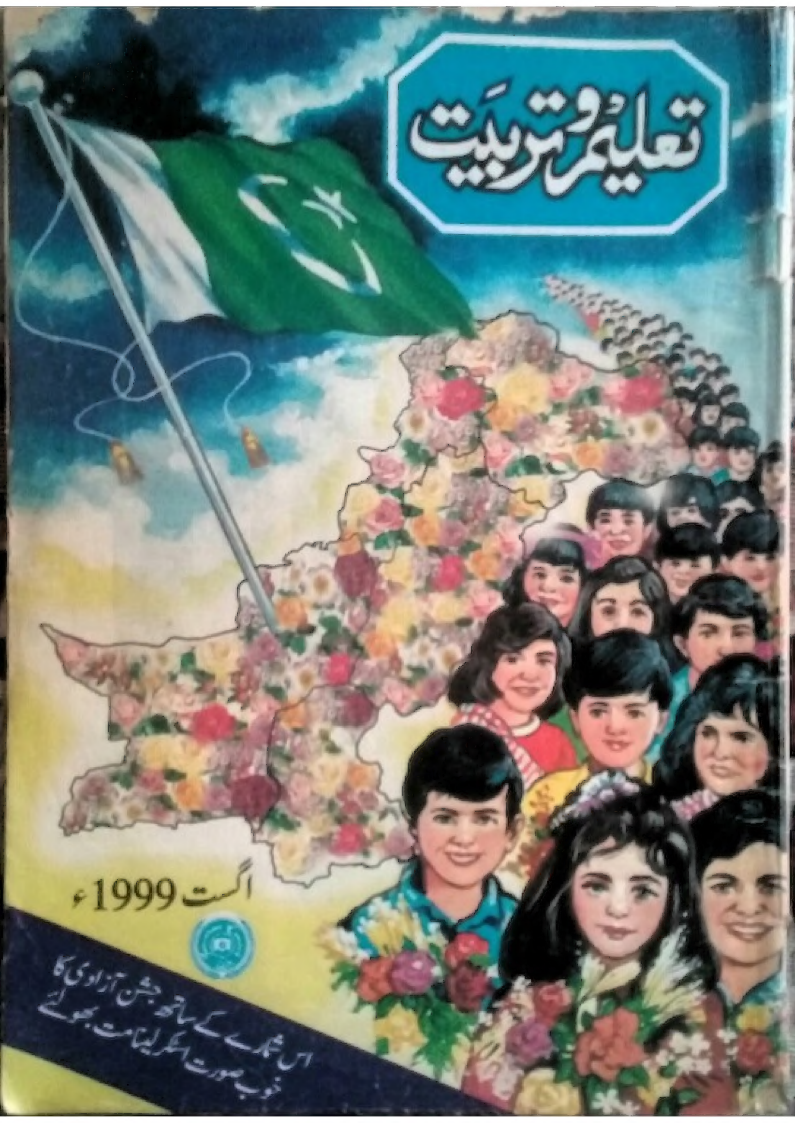

تعلیم و تربیت
اگست 1999ء
اس شمارے کے ساتھ جشن آزادی کا
خوب صورت اسٹکر لینا مت بھولیے

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا

سرکولیشن اسسٹنٹ	اسسٹنٹ ڈیزائننگ	خصوصی مشیر	سینئر اسسٹنٹ ایڈیٹر	مشیر	ایڈیٹر و پبلشر	چیف ایڈیٹر
محمد شیراز	شوکت اعجاز	محمود حسن رومی	رضوان ثاقب	سعید لخت	ظہیر سلام	عبدالسلام

تعلیم و تربیت

بچوں کا محبوب رسالہ

عظیم تمغہ

کیا کوئی پاکستانی فوجی سب سے بڑے فوجی اعزاز "نشان حیدر" سے بڑا تمغہ بھی حاصل کرسکتا ہے؟ جی ہاں! ایک ایسا تمغہ بھی ہے۔ "مگر کون سا؟" اس کا جواب اگلے مہینے یوم دفاع کے پس منظر میں شائع ہونے والی تحریر عظیم تمغہ میں موجود ہے۔ پاکستانی ہواباز کی لازوال جرأت اور حب الوطنی کے جذبے سے بھرپور یہ کہانی پڑھ کر یقیناً آپ اش اش کر اٹھیں گے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

آپ سب کو 52 واں یوم آزادی مبارک ہو۔ یہ 20 ویں صدی میں منایا جانے والا آخری یوم آزادی ہے۔ اگلے سال ہم ان شاء اللہ 21 ویں صدی میں اپنا یوم آزادی منائیں گے۔ دعا کریں کہ ہمارا ملک لاکھوں کروڑوں صدیاں شاد آزاد اور آباد رہے۔ آزادی بہت بڑی نعمت ہے۔ اس کی حفاظت ہمارا فرض ہے۔ ہم اپنے ملک کو اسی صورت میں ناقابل تسخیر بنا سکتے ہیں کہ خوب دل لگا کر علم حاصل کریں اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے ہر میدان میں پوری دنیا سے آگے نکل جائیں۔

امید ہے سب ساتھیوں نے چھٹیوں کا کام آدھے سے زیادہ ختم کرلیا ہوگا اور اکتاہٹ سے بچنے کے لئے جو مفید مشغلے ہم نے بتائے تھے، ان میں سے کوئی نہ کوئی ضرور اپنایا ہوگا۔ چھٹیوں کے کام اور اپنے مشاغل کے بارے میں ہمیں بھی لکھیں۔ لڑکیوں کے لیے الگ تھلگ سلسلہ شروع کرنے کے بارے میں آپ کی طرف سے کوئی خاص آراء موصول نہیں ہوئیں۔ اس لیے فی الحال یہ سلسلہ شروع نہیں کیا جارہا۔

آخر پر ایک غمگین خبر: بچوں کے ہردل عزیز شاعر پروفیسر خالد بزمی 13 جولائی 1999ء کو وفات پاگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آپ کی دو کتابیں بچپن کے نغمے اور سنو پیارے بچو، بچوں میں بہت مقبول ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان کے درجات بلند فرمائے۔ (آمین)

پرنٹر: عبدالسلام
مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائد اعظم لاہور

اگست 1999ء

قیمت فی پرچہ: 15 روپے
(رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی)

سرورق: گل زار بنا دیں گے

اس شمارے میں

وطن کے لیے (نظم)	ضیاء الحسن ضیا	2
تحفہ (کہانی)	محمد یونس حسرت	3
علی اور ولی (کہانی)	سعید لخت	6
عقلمند بگلا (کہانی)	میرزا ادیب	8
پاکستان ہمارا (کہانی)	سید نظر زیدی	13
بابا آزاد (کارٹون کہانی)	شاہد الحسن شاہد	16
فواد (سائنس فکشن)	محسن رضا کاظمی	19
ریشم کا وعدہ (کہانی)	بحر معراج	24
کرگل کا محاذ (کہانی)	سلیم خان گمی	30
وکٹر من اور اسپیڈ ماسٹر	ابن الطاف	34
دلچسپ اور قابل یقین	عبدالصمد خان طاہر	38
فتح (کہانی)	علی کمیل تصور	42
آپ بھی لکھیے		46
ذرا ہنسیے		51
ہونہار مصور		52
قربانی کا جذبہ (کہانی)	ڈاکٹر رضوان ثاقب	53
آپ کا خط ملا		59
لسی (نظم)	محمد طاہر ضیا	61
گل زار بنا دیں گے (کہانی)	فاروق حسن چوہدری	62
بلا عنوان کارٹون		66

باقی سب دلچسپ سلسلے حسب معمول

سالانہ قیمت: پاکستان میں (صرف رجسٹری کے ساتھ) =/345 روپے
مشرق وسطیٰ افریقہ (ہوائی ڈاک سے) =/690 روپے
یورپ (ہوائی ڈاک سے) =/770 روپے
امریکا مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے) =/890 روپے
پتا: ماہنامہ تعلیم و تربیت 32 شارع بن بادیس، لاہور
فون: 6278815 - 6278816 - 6361309 - 6361310

کام کرتے رہیں گے وطن کے لیے
ہنس کے ہر دکھ سہیں گے وطن کے لیے

ساری دنیا میں شان اس کی اونچی رہے
ہر قدم ہم بڑھیں گے وطن کے لیے

جن سے آپس میں پیار اور چاہت بڑھے
وہ ترانے لکھیں گے وطن کے لیے

اس کی سب بستیوں کو سجائیں گے ہم
اب جئیں اور مریں گے وطن کے لیے

چاند سے بڑھ کے روشن ہو پیارا وطن
خوب محنت کریں گے وطن کے لیے

سایہ چاہت کا اس پہ رکھیں گے ضیا
دھوپ میں خود جلیں گے وطن کے لیے

سلطنت عثمانیہ کی بحریہ یعنی سمندری فوج نے حال ہی میں اپنے دشمن کے خلاف ایک زبردست بحری جنگ کے بعد فتح حاصل کی تھی۔ بادشاہ سلامت کو جب اس فتح کی خبر ملی تو وہ بہت خوش ہوئے اور انہوں نے اپنے درباریوں سے مخاطب ہو کر کہا "ہماری یہ بہت بڑی کامیابی ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس کامیابی پر ہمیں اپنے امیرالبحر کو ایک تمغہ دینا چاہیے۔ ابھی ہماری طرف سے یہ حکم جاری کیا جائے کہ امیرالبحر دربار میں حاضر ہو تاکہ ہم اس کی بہادری کے صلے کے طور پر اسے تمغہ دیں"۔

دربار میں امیروں وزیروں کے علاوہ بری فوج کا کمانڈر ان چیف بھی موجود تھا۔ اب تک اسے اور امیرالبحر کو ملنے والے تمغے تعداد میں مساوی تھے۔ اس نے سوچا کہ اگر امیرالبحر کو تمغہ مل گیا تو اس کے تمغوں کی تعداد مجھ سے بڑھ جائے گی اور اس طرح اس کا مرتبہ مجھ سے بڑھ جائے گا۔ اس لیے اس نے آگے بڑھ کر بادشاہ کو جھک کر آداب بجا لاتے ہوئے کہا "عالی جاہ! اس جنگ کو جیتنے میں امیرالبحر کا کوئی کمال نہیں ہے۔ امیرالبحر تو محض حکم دیتا ہے۔ یہ تو بحریہ کے بہادر جوان ہیں جنہوں نے جنگ جیتی ہے"۔

"ہمارے خیال میں تم ٹھیک کہہ رہے ہو" بادشاہ نے کہا "لیکن ہم بحریہ کے ہر جوان کو تو تمغہ نہیں دے سکتے۔ کیوں نہ بحریہ کے سب سے بہادر جوان کو یہ تمغہ دیا جائے!"

کمانڈر ان چیف کو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ چناں چہ بادشاہ سلامت کے دربار سے امیرالبحر کے نام حکم جاری ہوا کہ وہ بحریہ کے سب سے بہادر جوان کو دربار شاہی میں بھیجے۔ اس حکم کی تعمیل میں چند دنوں کے بعد بحریہ کا ایک جوان شاہی دربار میں آیا جس کے متعلق بحریہ کے سارے جوانوں کی یہ رائے تھی کہ وہ سب سے بہادر ہے۔ اس کے بازوؤں پر پھول کھدے ہوئے تھے اور اس کے بدن پر سمندری نمک کی تہ سی جمی ہوئی تھی۔

"شاباش جوان!" بادشاہ نے اس کی طرف تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "کیا تم بتا سکتے ہو کہ تمہاری بہادری کا راز کیا ہے؟"

جوان نے اپنا سر کھجایا اور آنکھیں اپنے پپوٹوں میں گھماتے ہوئے سوچنے لگا کہ بادشاہ کے سوال کا کیا جواب دے۔ اس کے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں تھا کہ بہادری کس چڑیا کا نام ہے؟ اس نے تو صرف اتنا کچھ کیا تھا کہ جنگ کے دوران میں اپنی بہت ہی بلند آواز میں چیختا چنگھاڑتا ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر بھاگتا پھرتا رہا تھا اور اس کی اس حرکت کو اس کی بہادری کی دلیل سمجھ لیا گیا تھا۔ یہ بات اپنی

جگہ سہی مگر بادشاہ سلامت کے سوال کا کوئی نہ کوئی معقول جواب دینا بھی ضروری تھا۔ چناں چہ جو پہلی بات اس کے دماغ میں آئی اس نے وہی اگل دی۔ "عالی جاہ! یہ تو اس عمدہ گوشت کا کرشمہ ہے جو ہمیں جہازوں پر کھانے کو ملتا ہے۔ ہمارا باورچی ہمیں کھانے کو جو اعلیٰ درجے کا گوشت دیتا ہے' وہ ہمارے اندر شیروں جیسی بہادری پیدا کر دیتا ہے"۔

جوان کی یہ بات سن کر بادشاہ نے اپنے جی میں کہا "اگر واقعی باورچی بحریہ کے جوانوں کو ایسا گوشت کھانے کو دیتا ہے جو انہیں اتنا بہادر بنا دیتا ہے تو ہمارے خیال میں تو جنگ جیتنے کا تمغہ اس باورچی کو ملنا چاہیے"۔

چناں چہ اس نے شاہی بحریہ کے اکلوتے بحری جہاز کے باورچی کو بلوا بھیجا۔ جب باورچی دربار میں حاضر ہوا تو بادشاہ نے اس کی طرف تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "ہم نے سنا ہے کہ تم بحریہ کے جوانوں کو جو گوشت کھانے کو دیتے ہو وہ انہیں شیر جیسا بہادر بنا دیتا ہے۔ یقیناً تمہارے پاس کوئی خاص مسالا ہو گا جو تم گوشت میں ڈالتے ہو گے یا پھر تمہارے پاس اس کے پکانے کی کوئی خاص ترکیب ہو گی"۔

اس باورچی کا ماجرا یہ تھا کہ وہ بحریہ میں شامل ہونے سے پہلے بڑھئی کا کام کرتا تھا۔ وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ بحریہ میں بھرتی ہوا تھا جو باورچی کا کام کرتا تھا اور لطیفہ یہ ہوا تھا کہ بحریہ کی ملازمت نے بڑھئی کو باورچی اور باورچی کو بڑھئی بنا دیا تھا۔ اس لحاظ سے وہ کوئی ایسا اچھا باورچی نہ تھا۔ اس کے پاس نہ تو کوئی خاص مسالا تھا اور نہ اس کے پاس گوشت پکانے کی کوئی خاص ترکیب تھی۔ وہ تو سب کچھ ابال کر جوانوں کے آگے رکھ دیتا تھا اور بحریہ کے بھوکے جوان نمک مرچ یا کسی اور مسالے کی کمی یا زیادتی کی شکایت کے بغیر سب کچھ چٹ کر جاتے تھے۔ یہ بات اپنی جگہ سہی مگر بادشاہ سلامت کے سوال کا کوئی نہ کوئی معقول جواب دینا بھی ضروری تھا۔ چناں چہ سوچتے سوچتے جو پہلی بات اس کے دماغ میں آئی اس نے وہی اگل دی "عالی جاہ! میرے پاس نہ تو کوئی خاص مسالا ہے اور نہ میں کسی خاص ترکیب سے گوشت پکاتا ہوں' بلکہ مجھے تو اسے کچھ زیادہ پکانا بھی نہیں پڑتا۔ اس کی وجہ یہ ہے حضور! کہ جن گایوں کا وہ گوشت ہوتا ہے وہ بڑی موٹی تازی ہوتی ہیں اور اپنے نرم اور مزے دار گوشت کے لیے دنیا بھر میں مشہور ہیں"۔

باورچی کی یہ بات سن کر بادشاہ نے اپنے جی میں کہا "اگر واقعی یہ گایوں ہی کا گوشت ہے جو بحریہ کے جوانوں کو اتنا بہادر بنا دیتا ہے تو ہمارے خیال میں یہ جنگ جیتنے کا تمغہ اس شخص کو ملنا چاہیے جو یہ گائیں پالتا ہے"۔

چناں چہ اس نے گائیں پالنے والے کو بلوا بھیجا۔ گائیں پالنے والا جب دربار میں حاضر ہوا تو بادشاہ نے اس کی طرف تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "ہم نے سنا ہے کہ تمہاری موٹی تازی گایوں کا گوشت کھا کر ہماری بحریہ کے جوان شیر کی طرح بہادر بن جاتے ہیں۔ یقیناً تم اپنی گایوں کو کوئی خاص خوراک کھلاتے ہو گے جس سے وہ موٹی تازی بھی ہو جاتی ہیں اور ان کا گوشت بھی بے حد خستہ اور لذیذ ہو جاتا ہے۔ ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ تم اپنی گایوں کو کیا خاص خوراک کھلاتے ہو؟"

گائیں پالنے والے نے بادشاہ سلامت کو آداب بجا لا کر عرض کیا "عالی جاہ! میں تو اپنی گایوں کو کوئی خاص خوراک نہیں دیتا۔ میں تو انہیں پڑوسی زمین کے کھیتوں میں کھلا چھوڑ دیتا ہوں۔ جہاں وہ سارا دن چٹیتا (تین پتوں والی) گھاس چرتی رہتی ہیں۔ میرا خیال ہے یہی چٹیتا گھاس کھا کر وہ اتنی موٹی تازی ہو جاتی ہیں' عالی جاہ!"

گائیں پالنے والے کی یہ بات سن کر بادشاہ نے اپنے جی میں کہا "اگر واقعی یہ چٹیتا گھاس ہی ہے جسے کھا کر گائیں اس قدر موٹی تازی ہو جاتی ہیں کہ ان کا گوشت بحریہ کے جوانوں کو شیر کی طرح بہادر بنا دیتا ہے تو ہمارے خیال میں یہ جنگ جیتنے کا تمغہ اس زمین دار کو ملنا چاہیے جو اپنے کھیتوں میں چٹیتا گھاس اگاتا ہے"۔

چناں چہ اس نے اس زمین دار کو بلا بھیجا۔ زمین دار

جب دربار میں حاضر ہوا تو بادشاہ نے اس کی طرف تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "ہم نے سنا ہے کہ تم اپنے کھیتوں میں جو چتیا گھاس اگاتے ہو اسے کھا کر گائیں اتنی موٹی تازی ہو جاتی ہیں اور ان کا گوشت ایسا عمدہ اور لذیذ ہو جاتا ہے کہ اسے کھا کر بحریہ کے جوان شیر کی طرح بہادر ہو جاتے ہیں۔ ہمیں یہ بتاؤ کہ تم یہ چتیا گھاس کس طرح اگاتے ہو اور اسے اگانے کے لیے کیا کچھ کرتے ہو؟"

زمین دار بادشاہ کا سوال سن کر سر کھجاتے ہوئے کچھ سوچنے لگا۔ گھبراہٹ کے مارے وہ اپنے ہاتھوں کو بار بار مروڑ رہا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ بادشاہ سلامت کے سوال کے جواب میں کیا کہے اور کیا نہ کہے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اس کے کھیتوں میں چتیا گھاس خود بخود اگتی تھی۔ اس کو نہ اسے اگانا پڑتا تھا اور نہ پانی دینا پڑتا تھا۔ اس نے تو گائیں پالنے والے کو گائیں اپنے کھیتوں میں چھوڑ دینے کی اجازت صرف اس لیے دے رکھی تھی کہ اس طرح گائیں اس کے کھیتوں سے چتیا گھاس اور دوسری جڑی بوٹیاں کھا لیتی تھیں اور اس طرح وہ اپنے کھیتوں کو چتیا گھاس اور دوسری جڑی بوٹیوں سے صاف کرنے کی مشقت سے بچ جاتا تھا مگر وہ یہ بات بادشاہ کو تو نہیں بتا سکتا تھا۔ دوسری طرف بادشاہ کے سوال کا بھی کوئی نہ کوئی معقول جواب دینا ضروری تھا۔ چناں چہ اس نے زبان کھولی "عرض یہ ہے عالی جاہ! اس کام کے لیے......"

وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا یا شاید اس لیے رک گیا کہ اسے کوئی معقول جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔ وہ رکا تو بادشاہ نے بے چینی سے کہا۔

"ہاں ہاں بولو، بولو، رک کیوں گئے۔ ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ تم یہ چتیا گھاس کیسے اگاتے ہو؟"

"حضورا" زمین دار نے کچھ جھجک جھجک کر کہا "یہ گھاس میں نہیں اگاتا، آپ کے بلند اقبال کے لیے اپنے آپ اگتی ہے"۔

"اپنے آپ اگتی ہے؟" بادشاہ نے حیران سا ہو کر کہا۔

"ہاں حضورا" زمین دار نے جواب دیا"۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" بادشاہ نے اور بھی حیران ہو کر کہا "زمین سے تو وہی چیز اگتی ہے جس کا بیج زمین میں ڈالا جائے"۔

"آپ درست فرماتے ہیں حضورا" زمین دار نے کسی قدر جوش سے کہا۔ بادشاہ کی بات سے اسے ایک نکتہ سوجھ گیا تھا اور اس نکتے سے بات کچھ کچھ بن سکتی تھی۔ اس نے کہا۔ "بات یہ ہے حضورا آپ کی حکومت کا سکہ ہمارے علاوہ ہوا پر بھی چلتا ہے۔ یہ آپ کے اقبال کی برکت ہے کہ ہوا چتیا گھاس اور دوسری جڑی بوٹیوں کے بیج آپ کے دشمنوں کے علاقوں سے اڑا کر میرے کھیتوں میں لا ڈالتی ہے۔ اس طرح میرے کھیتوں میں چتیا گھاس اور جڑی بوٹیاں اگتی ہیں جنہیں کھا کر وہ گائیں موٹی تازی ہو جاتی ہیں عالی جاہ!"

زمین دار کی یہ بات سن کر بادشاہ نے اپنے جی میں کہا "اگر ہوا ہی اس زمین دار کے کھیتوں میں اس چتیا گھاس کے بیج ڈالتی ہے جسے کھا کر گائیں اس قدر موٹی تازی ہو جاتی ہیں کہ ان کا گوشت بحریہ کے جوانوں کو شیر کی طرح بہادر بنا دیتا ہے تو ہمارے خیال میں یہ جنگ جیتنے کا تمغہ اس ہوا کو ملنا چاہیے"۔

چناں چہ اس نے اپنے درباریوں کو حکم دیا کہ وہ ہوا کو اس کے دربار میں پیش کریں تاکہ جنگ جیتنے کا تمغہ اسے دیا جا سکے۔

بادشاہ کا حکم پا کر درباری ہوا کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ اس واقعے کو مدت گزر گئی ہے مگر سنا ہے کہ بادشاہ کے درباری اب بھی ہوا کی تلاش میں جگہ جگہ پھر رہے ہیں۔

(تھامس میک گروون کی کہانی "دی بیٹل آف پیشن بے" سے اخذ و ترجمہ)

☆ ☆ ☆

علی اور ولی

سعید لخت

علی بہت پیارا بچہ ہے۔ اپنے ابو اور امی کا کہا مانتا ہے۔ دوستوں کے ساتھ مل جل کر کھیلتا ہے۔ کبھی سے لڑتا جھگڑتا نہیں۔ وہ روز، صبح کو ہنستا ہوا اٹھتا ہے۔ پہلے ابو اور امی کو سلام کرتا ہے، پھر باتھ روم میں جا کر، ٹوتھ برش سے دانت صاف کرتا ہے۔ اس کے بعد نہاتا ہے اور صاف ستھرے کپڑے پہن کر ناشتا کرتا ہے۔ امی اسے جو کچھ کھانے کو دیتی ہیں، ہنسی خوشی کھا لیتا ہے۔ گھر کے سب لوگ اسے پیار کرتے ہیں۔

لیکن علی میں جہاں اتنی اچھائیاں ہیں، وہاں ایک برائی بھی ہے۔ وہ ہر چیز کو کھول کر، توڑ کر، یہ دیکھنے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کے اندر کیا ہے۔ اس نے اپنے بہت سے کھلونے اور گھر کی کئی چیزیں توڑ پھوڑ دی ہیں۔ اس کی اس عادت سے اس کے ابو اور امی بہت پریشان ہیں۔

علی کے بہت سے دوست ہیں۔ کبھی وہ علی کے گھر آجاتے ہیں اور کبھی علی ان کے گھر چلا جاتا ہے۔ سب مل کر خوب کھیلتے ہیں۔

ایک دن علی کا ایک دوست، ولی اس کے گھر آیا۔ وہ چاکلیٹ اور ٹافیاں بہت کھاتا ہے، اس لیے بہت موٹا ہو گیا ہے۔ اس کے دانت بھی خراب ہو گئے ہیں، کیوں کہ وہ رات کو سونے سے پہلے دانت صاف نہیں کرتا۔ اس نے علی سے کہا کہ میرے ماموں میرے لیے لندن سے کھلونے لائے ہیں۔ میرے گھر چلو دونوں کھیلیں گے۔

ولی کا گھر قریب ہی ہے اور وہاں جانے کے لیے سڑک پار کرنا نہیں پڑتی۔ اس لیے امی نے علی کو ولی کے گھر جانے کی اجازت دے دی اور وہ دونوں انہیں خدا حافظ کہ کر چلے گئے۔

علی کے گھر کے پاس کچھ مزدور سڑک کھود کر سیوریج کے پائپ بچھا رہے تھے۔ علی اور ولی چلتے چلتے رک گئے اور مزدوروں کو دیکھنے لگے۔ پھر آگے بڑھ گئے۔ آگے، سڑک

کے کنارے' ایک جھاڑی تھی اور اس جھاڑی کے نیچے ایک تھیلا پڑا تھا۔ علی کو چاہیے تھا کہ چپ چاپ آگے بڑھ جاتا اور اس تھیلے کو نہ کھولتا۔ کیوں کہ یہ اس کی چیز نہیں تھی' اور پرائی چیز کو چھیڑنا بہت بری بات ہے۔ لیکن اسے تو ہر چیز کا کھوج لگانے کی عادت تھی۔ وہ آگے بڑھا اور تھیلا کھول کر دیکھنے لگا۔

تھیلے کے اندر بہت سے ڈبے تھے۔ علی نے ایک ڈبے کا ڈھکن کھولا تو اس میں ایک پراٹھا اور آملیٹ رکھا تھا۔ اس کی دیکھا دیکھی ولی نے بھی ایک ڈبا کھولا۔ اس میں ایک پراٹھا اور دو شامی کباب رکھے تھے۔

موٹا ولی آملیٹ بہت شوق سے کھاتا ہے۔ اس نے علی سے کہا "یہ آملیٹ میں کھاؤں گا۔ تم شامی کباب کھا لو"۔

علی بولا "میری امی کہتی ہیں کہ زمین پر پڑی ہوئی چیزیں اٹھا کر نہیں کھانا چاہیے۔ اس سے بیمار ہو جاتے ہیں"۔ یہ کہہ کر اس نے ڈبوں کے ڈھکن بند کر دیے۔ لیکن پھر اسے شرارت سوجھی۔ اس نے ولی سے کہا "آؤ ولی فٹ بال کھیلیں"۔

اس نے ایک ڈبے کو زور سے ٹھوکر ماری۔ ڈبا لڑھکتا ہوا دور چلا گیا۔ دونوں خوب ہنسے۔ اب ولی نے ایک ڈبے کو ٹھوکر ماری۔ وہ بھی لڑھکتا ہوا دور چلا گیا۔ انہوں نے تھیلے میں سے سارے ڈبے نکال لیے اور انہیں ٹھوکریں مارنے لگے۔ کئی ڈبوں کے ڈھکن کھل گئے اور ان کے اندر رکھے ہوئے پراٹھے' آملیٹ اور شامی کباب زمین پر گر کر گندے ہو گئے۔

وہ ڈبوں کو ٹھوکریں مار رہے تھے کہ پیچھے سے کسی نے ڈانٹ کر کہا "یہ تم کیا کر رہے ہو' شیطانو! تم نے ہمارا سارا کھانا خراب کر دیا!"

علی اور ولی نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک لمبا سا' موٹا سا' مزدور دوڑتا ہوا ان کی طرف آ رہا تھا۔ وہ بہت غصے میں تھا۔ دونوں بچے ڈر گئے۔ انہوں نے سوچا کہ یہ موٹا آدمی ہمیں مارے گا۔ انہوں نے دوڑ لگا دی۔ وہ آدمی بھی ان کے پیچھے دوڑتا ہوا آ رہا تھا۔

کھانے کے یہ ڈبے انہی مزدوروں کے تھے۔ انہوں نے ڈبوں کو تھیلے میں ڈال کر جھاڑی کے نیچے رکھ دیا تھا کہ دوپہر کو کھائیں گے۔

علی اور ولی دوڑتے چلے جا رہے تھے اور اس موٹے مزدور کے ساتھ دوسرے مزدور بھی ان کے پیچھے بھاگتے ہوئے آ رہے تھے۔ سڑک کے کنارے سیوریج کے کئی پائپ پڑے ہوئے تھے۔ جب علی اور ولی نے یہ دیکھا کہ وہ مزدوروں سے نہیں بچ سکیں گے تو وہ ایک پائپ کے اندر گھس گئے۔

پہلے علی پائپ میں گھسا اور پھر ولی بھی گھس گیا۔ علی دبلا پتلا تھا۔ وہ آسانی سے پائپ کے اندر چلا گیا۔ ولی موٹا تھا۔ وہ پائپ میں پھنس گیا اور لگا چیخیں مارنے "بچاؤ! بچاؤ! ارے کوئی بچاؤ!" اس کی چیخیں سن کر ولی بھی چیخنے لگا۔ اب دونوں زور زور سے چیخ رہے تھے۔

آخر اس موٹے مزدور کو ان پر رحم آ گیا۔ اس نے ولی کو کھینچ کر باہر نکالا۔ اس کے بعد علی بھی باہر آ گیا۔ دونوں ڈرے ہوئے تھے اور شرمندہ بھی تھے۔

ولی نے سر جھکا کر کہا "انکل' ہمیں پتا نہیں تھا کہ یہ آپ کا کھانا ہے"۔

علی بولا "ہمیں افسوس ہے کہ ہم نے آپ کا کھانا خراب کر دیا۔ ہمیں معاف کر دیجیے"۔

موٹا مزدور بولا "ہم آپ کو ایک شرط پر معاف کریں گے۔ وعدہ کیجیے کہ اب کبھی ایسی حرکت نہیں کریں گے"۔

دونوں بچے بولے "ہم وعدہ کرتے ہیں کبھی ایسی حرکت نہیں کریں گے"۔

"شاباش!" موٹے مزدور نے کہا "اچھا' اب آنسو پونچھ لیجیے اور سیدھے گھر جائیے"۔

علی اور ولی نے آنسو پونچھے اور گھر کی طرف چل دیے۔

عقل مند پاگل

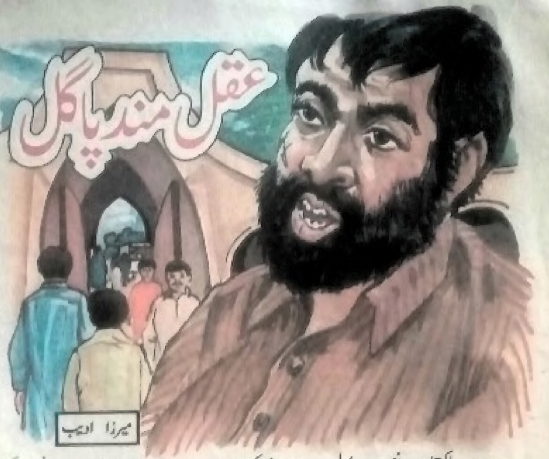

میرزا ادیب

یہ پاکستان بننے سے پہلے اس زمانے کی بات ہے جب لاہور کی آبادی موجودہ آبادی سے بہت کم تھی۔ لاہور کے دروازوں کے باہر عام طور پر یا تو باغات ہوتے تھے یا کھیت نظر آتے تھے۔ بھاٹی دروازے کے باہر بھی دور دور تک باغ ہی باغ تھے۔ ان کے بعد کھیت شروع ہو جاتے تھے۔

گھومنے پھرنے کا مجھے بچپن سے شوق ہے۔ میری عادت تھی کہ اپنے کسی دوست کو ساتھ لے کر ادھر ادھر گھومتا پھرتا رہتا اور جس وقت میں یا میرا دوست تھک جاتا تو واپس آجاتے۔ رات کو خوب نیند آتی اور اسکول جانے کے لیے صبح سویرے جاگنا مشکل ہو جاتا۔

ایک روز اسکول سے چھٹی تھی' ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ ایسا وقت سیر کے لیے بڑا مناسب ہوتا ہے۔ میں نے کوشش کی کہ اپنے کسی دوست کو ساتھ لے کر کہیں دور نکل جاؤں۔ محلے میں جتنے لڑکوں کو جانتا تھا' ان میں سے ایک ایک سے کہا کہ آؤ سیر کریں' مگر ہر ایک نے کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیا۔ جب کوئی بھی میرا ساتھ دینے کے لیے تیار نہ ہوا تو میں تنہا نکل پڑا۔

سیر میں بہت لطف آیا۔ واپسی کی سوچ رہا تھا کہ ایک منظر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک جگہ جہاں بارش کا پانی جمع ہو کر تالاب کی صورت اختیار کر گیا ہے وہاں ایک شخص کاغذ کی کشتیاں بنا کر پانی میں بہا رہا ہے اور جب ایک کشتی پانی میں بہا دیتا ہے تو خوش ہو کر تالیاں بجانے لگتا ہے۔ یہ کھیل بچوں کا ہے۔ بچے یہ کھیل کھیلتے رہتے ہیں' مگر کوئی بڑی عمر کا آدمی ایسا نہیں کرتا۔ بچے بھی اس طرح تالیاں نہیں بجاتے جس طرح وہ بجا رہا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی لیکن اس کے قریب جانے سے ڈر بھی لگتا تھا کہ جو شخص بچوں کا کھیل کھیل رہا ہے اس کا دماغ صحیح نہیں ہو گا۔ میں فوراً لوٹ آیا۔ اپنے دوستوں سے اس واقعے کا ذکر کیا تو سب نے یہی کہا کہ وہ کوئی پاگل ہو گا۔

چند روز بعد مجھے اپنے ابا جی کے ساتھ ایک دعوت میں جانے کا موقع ملا تو میں نے دیکھا کہ وہی تالاب میں کاغذ کی کشتیاں بہانے والا آدمی کھانے کے ہال میں ایک طرف کرسی پر بیٹھا ہے اور اس کے آگے میز کے اوپر کھانے کا ڈھیر سارا سامان پڑا ہے۔ مگر وہ ہے کہ ان چیزوں پر نظر ہی نہیں ڈالتا۔ ادھر ادھر دیکھ رہا ہے۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ ہال میں جو شخص بھی آتا ہے' اسے دیکھ کر اس طرح اپنا ہاتھ ہلا دیتا ہے جیسے اس کی خیریت دریافت کر رہا ہو۔ لگتا تھا وہ سب سے بے نیاز ہے۔ بس کبھی کبھی اپنا سر ہلا دیتا ہے۔

گھر آکر میں نے ابا جی سے پوچھا: "ابا جی' وہ کون تھا جو پاگلوں کی طرح سب کو دیکھ رہا تھا؟"

"کون بیٹا؟"

"ابا جی! وہ آدمی جس کے آگے میز پر کھانا پڑا تھا اور وہ کھا ہی نہیں رہا تھا۔"

ابا جی نے ذرا سوچا' پھر بولے "تمہاری مراد شیخ نعیم صاحب کے چھوٹے بھائی سلیم سے تو نہیں؟"

"کیا اس کا نام سلیم ہے ابا جی؟"

"معلوم ہوتا ہے تم اسی کے متعلق پوچھ رہے ہو"۔

میں نے ابا جی کو بتایا کہ چند روز پہلے یہی شخص اکیلا پانی میں کاغذ کی کشتیاں بہا بہا کر تالیاں بجا رہا تھا۔

"اور کیا کرتا ریاض بیٹا؟"

"کیوں ابا جی؟"

"ریاض بیٹا بدقسمتی سے شیخ نعیم صاحب کا یہ چھوٹا بھائی ذہنی توازن کھو بیٹھا ہے۔ ان کا بس یہی ایک بھائی ہے۔ اسے پاگل دیکھ کر انہیں بہت دکھ ہوتا ہے"۔

میرا اندازہ صحیح نکلا تھا۔ میں نے بھی اسے پاگل ہی سمجھا تھا۔

وہ پاگل ایک روز ہمارے اسکول میں بھی آگیا۔ اس کی جھولی بسکٹوں' چاکلیٹوں اور میٹھے چنوں سے بھری ہوئی تھی۔ لڑکوں نے اس کے اردگرد گھیرا ڈال رکھا تھا۔ جو بھی اس کے ذرا قریب جاتا وہ جھولی میں ہاتھ ڈال کر مٹھی بھر کر دے دیتا۔ ایک لڑکا مجھے بھی مجبور کر کے اس کے سامنے لے گیا۔

دوسرے لڑکوں کی طرف تو وہ ایک دو لمحے دیکھ لیتا تھا اور مٹھی میں جو کچھ ہوتا تھا وہ اسے دے کر رخصت کر دیتا تھا۔ میں اس کے پاس گیا تو وہ مجھے غور سے دیکھنے لگا۔ میں ڈر کر بھاگنے ہی والا تھا کہ اس نے جلدی سے میرے پاؤں پر پاؤں رکھ دیا اور قہقہے مارنے لگا۔

بڑی مشکل سے میں نے اپنی جان چھڑائی اور گھر آگیا اور عہد کر لیا کہ اب کبھی اس کو دیکھوں گا تو اس کے قریب ہرگز نہیں جاؤں گا' مگر پھر کبھی اس کے قریب جانے کی نوبت ہی نہ آئی کیوں کہ پھر وہ کہیں بھی دکھائی نہ دیا۔ میں نے سمجھ لیا کہ وہ ضرور پاگل خانے میں ہو گا اور کیا پتا پاگل خانے میں جانے سے پہلے ہی مر کھپ گیا ہو۔

اس کا خیال میرے ذہن سے قریب قریب نکل گیا۔ میں جوان ہو گیا۔ شادی ہو گئی اور دو بچوں کا باپ بھی بن گیا۔ جس دفتر میں میں ملازم تھا وہاں سے میں نے استعفیٰ دے دیا اور کراچی پہنچ کر ایک کاروباری ادارے سے منسلک ہو گیا۔ یہ ادارہ قالینوں کا کاروبار کرتا تھا اور میں اس کے شوروم کا انچارج تھا۔ عام گاہک آتے تھے تو ماتحت ملازم ان سے گفت گو کر لیتے تھے مگر کوئی معزز آدمی قالین خریدنے کے لیے آتا تھا تو میں خود اس سے بات چیت کرتا تھا۔

ایک روز میں شوروم

میں اپنے کیبن کے اندر دور دراز ملکوں سے آئی ہوئی چٹھیوں کے جواب لکھ رہا تھا کہ ایک ملازم نے اندر آکر اطلاع دی "کوئی بڑے آدمی آئے ہیں"۔

بڑے آدمی سے ملنا میرا فرض تھا۔ میں فوراً کیبن سے باہر نکلا۔ ایک فربہ اندام شخص ایک قالین کے بارے میں کچھ پوچھ رہا تھا۔ میں اس کے پاس پہنچا تو ایک دم یوں لگا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔

اس کا چہرہ اس پاگل کے چہرے سے مشابہ تھا جسے میں نے سال ہا سال پہلے مختلف مقامات پر دیکھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں ٹھٹک گیا۔

"یہ قالین ہمیں پسند ہے' کیا قیمت ہو گی؟"

یہ سوال میں نے سن لیا تھا' مگر اسے دیکھ کر اس قدر حیران ہو گیا تھا کہ جواب نہ دے سکا۔ جب دو تین لمحے جواب نہ ملا تو اس نے قالین سے نگاہیں ہٹا کر مجھے دیکھا۔ ہو بہو وہی شکل تھی' اسی پاگل کی شکل۔

"یا اللہ! یہ کیا ماجرا ہے؟" میں نے اپنے دل میں کہا۔

"قیمت نہیں بتائی آپ نے؟" اس نے پوچھا۔

"اوہ معاف کیجئے۔ آیئے کیبن میں بیٹھ کر گفت گو کرتے ہیں"۔

میں اسے اپنے کیبن میں لے آیا۔ ملازم سے چائے کے لیے کہا اور اسے قالین کی قیمت بتا دی۔ قیمت سن کر اس نے اپنے بیگ میں سے چیک بک نکالی "چیک لینے میں آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"جی اعتراض تو کوئی نہیں۔ مگر اس فرم کا یہ اصول نہیں ہے"۔

"گویا آپ کیش لیتے ہیں" یہ کہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ پھر چند لمحے بعد بولا "ٹھیک ہے یوں کرتے ہیں ہم چیک دیے جاتے ہیں۔ کل کیش ہو جائے گا۔ شام کو ہمارا آدمی رقعہ لے کر آئے گا تو قالین اس کے حوالے کر دیں"۔

بات معقول تھی' کیسے قبول نہ کرتا۔ چائے پیتے ہوئے میں بار بار اسے کنکھیوں سے دیکھ لیتا تھا۔ لیکن وہ میری اس حرکت سے بالکل بے نیاز تھا۔ پھر وہ چلا گیا۔

میں نے اس عجیب و غریب معاملے پر ذرا غور کیا تو شرم سار ہو گیا۔ آخر میں نے کیا بے ہودگی کی تھی! دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کی صورتیں آپس میں ملتی جلتی ہیں۔ اس معزز آدمی کی شکل بھی اس پاگل جیسی ہے تو اس میں حیرت کی بھلا کیا بات ہے؟ میں نے سوچا اور زیادہ شرمندگی محسوس کرنے لگا۔

مجھے یہ خیال بھی تکلیف دے رہا تھا کہ اس شخص نے ضرور میری بے ہودگی محسوس کر لی ہو گی۔ لیکن اس کے چہرے سے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے میری کسی غیر معمولی حرکت کو محسوس ہی نہیں کیا۔ یہ سوچ کر میں نے اپنے آپ کو تسلی دی۔

دوسرے روز میں اپنی ذمے داریاں پوری کرنے کی خاطر شوروم میں گیا اور اپنے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ شام کے وقت اپنی چیزیں سنبھال رہا تھا اور کاغذات میز کی درازوں میں رکھ رہا تھا کہ ایک آدمی میرے کیبن میں آ گیا۔

"جناب! مجھے سیٹھ صاحب نے بھیجا ہے" اس نے کہا "قالین کے لیے"

"سیٹھ صاحب؟ .... کل انھوں نے چیک دیا تھا نا؟" مجھے یاد آگیا۔ "ہاں ہاں"

اسی وقت کیشیئر نے آکر اطلاع دی کہ وہ چیک کیش ہو گیا ہے تو میں نے کہا "لے جایئے قالین' یہ ان کی امانت ہے"۔

اسے یہ لفظ سن کر قالین لے جانے کے لیے میرے کیبن سے باہر نکل جانا چاہیے تھا مگر وہ وہیں کھڑا رہا۔ "اور کیا حکم ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سیٹھ صاحب نے فرمایا ہے' تکلیف فرما کر میرے ساتھ چائے پئیں"۔

مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ سیٹھ صاحب کا میرے ساتھ کیا تعلق واسطہ' کیوں مجھے چائے پر بلا رہے ہیں۔ میری اس دوکان کی ذمے داریاں ختم ہو چکی تھیں اور میں گھر جانے کے لیے آزاد تھا۔

"جی میں قالین گاڑی میں رکھ لیتا ہوں' آپ باہر آجائیے" اس نے کہا۔

"عجیب معاملہ ہے۔ یہ سیٹھ ہے کون؟ کیوں بلا رہا ہے مجھے؟ آخر اب تو جانا ہی پڑے گا۔ دیکھوں تو سہی آخر ہے کون اور کہتا کیا ہے" میں نے دل میں کہا۔

گاڑی ایک شان دار بنگلے میں جا کر رک گئی۔ "آئیے صاحب" ڈرائیور نے کہا۔ میں اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

"تو آپ تشریف لے آئے!" سیٹھ صاحب نے جو ایک کمرے کے دروازے پر کھڑے تھے' مجھ سے مخاطب ہو کر یہ الفاظ کہے۔

"آپ نے یاد فرمایا ہے' حاضر ہو گیا ہوں" میں نے جواب دیا۔

"شکریہ آپ کا' اندر آجائیے"۔

میں اندر گیا۔ بڑا شان دار کمرا تھا۔ فرنیچر اعلیٰ درجے کا' ہر شے قیمتی اور نفیس تھی۔ میں صوفے پر بیٹھ گیا۔

"آپ کو کوئی حرج تو نہیں ہوا"۔ وہ دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"جی نہیں' کوئی حرج نہیں ہوا"۔

"دیکھیے میں نے آپ کو اس وجہ سے زحمت دی ہے کہ آپ سے کچھ باتیں کروں"۔

"کون سی باتیں سیٹھ صاحب؟" میں نے سوال کیا۔

"قالینوں کے بارے میں نہیں۔ یہ باتیں تو شوروم میں ہونی چاہئیں' یہاں نہیں"۔ یہ کہتے ہوئے وہ مسکرایا۔

"درست فرمایا ہے آپ نے۔ تو پھر وہ کون سی باتیں ہیں؟"

"سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آپ مجھے دیکھ کر ٹھٹک کیوں گئے تھے؟"

میں یہ الفاظ سننے کے لیے قطعاً تیار نہ تھا' کیوں کہ میرا خیال تھا کہ اس نے میری کسی حرکت کو بھی محسوس نہیں کیا تھا' مگر اب وہ کہہ رہا تھا کہ آپ مجھے دیکھ کر ٹھٹک کیوں گئے تھے۔ گویا اس نے میری گھبراہٹ محسوس کر لی تھی لیکن اس کا اظہار قطعی طور پر نہیں کیا تھا۔

"میں آپ کا مطلب سمجھا نہیں" میں نے کہا۔

"مطلب تو بالکل صاف ہے۔ آپ پہلے تو مضطرب ہو گئے تھے' پھر آپ نے دو تین بار مجھے کنکھیوں سے بھی دیکھا تھا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

میں کیا کہتا' خاموش رہا۔

"لگتا ہے آپ نے مجھے پہچان لیا ہے" یہ کہہ کر اس نے زور سے قہقہہ مارا "اور چونکہ میں نے بھی آپ کو جان لیا ہے" اس نے دوسرا قہقہہ لگایا۔

میری الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔

"دیکھو دوست' اب تکلف چھوڑ دو۔ تم یہ کیوں نہیں

سید نظر زیدی

پاکستان زندہ باد

ریٹائرڈ میجر محبت علی خاں موٹے شیشوں کی عینک لگائے اخبار پڑھ رہے تھے۔ ان کا پوتا انور علی چپکے سے آیا اور زور سے "ہوں" کر کے انہیں ڈرانے کی کوشش کی۔ وہ ہنستے ہوئے بولے "بچے، جو لوگ توپوں کی گھن گرج سے نہیں ڈرے تمہاری ہوں سے کیسے ڈر جائیں گے۔ جلدی سے آگے آؤ اور یہ بتاؤ کہ اس وقت تشریف لانے کا مقصد کیا ہے؟"

انور علی ہنستا ہوا آگے بڑھا اور میجر صاحب کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا "بس دادا جان آپ کو دیکھنے کے لئے آیا تھا، آپ ہر وقت پڑھتے رہتے ہیں۔ آپ کی آنکھیں تھکتی نہیں؟"

"یہ میجر کی آنکھیں ہیں بچے، کتاب یا اخبار پڑھتے ہوئے تو ان کی روشنی اور بڑھ جاتی ہے۔ اچھا خیر اس قصے کو چھوڑو اور اپنے آنے کا اصل مقصد بیان کرو، ہم جانتے ہیں ہمارا بیٹا اس وقت ہمارے پاس آتا ہے جب کوئی نہ کوئی غرض ہوتی ہے۔ کچھ پیسے ویسے چاہئیں کیا؟"

"نہیں دادا جان، اس وقت تو میں یہ پوچھنے کے لئے آیا ہوں کہ پاکستان اور بھارت میں جنگ ہو گی یا نہیں۔ جب سے کشمیری مجاہدین نے کارگل میں شان دار کام یابی حاصل کی ہے لوگ کہہ رہے ہیں کہ اب ان دونوں ملکوں میں لڑائی ضرور ہو گی؟"

میجر صاحب اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے بولے "بیٹے، تمہارے اس سوال کا جواب تو ہم بعد میں دیں گے پہلے یہ بتاؤ خود تم نے جنگ کی کچھ تیاری کی ہے یا نہیں؟"

"بہت زور دار تیاری کی ہے دادا جان، اپنی چھروں والی بندوق کی صفائی کی ہے۔ چھرے خرید کر لایا ہوں اور نشانہ پکا کرنے کی مشق کر رہا ہوں"۔

"بہت خوب، بہت خوب" میجر صاحب نے اپنے پوتے کی کمر تھپکی۔ پھر سنجیدہ ہو کر بولے "یہ سب کچھ تو تم ٹھیک کر رہے ہو بیٹے، لیکن اس کے ساتھ یہ دعا بھی ضرور کرو کہ ان دونوں پڑوسی ملکوں کے درمیان جنگ نہ ہو۔ خدا بھارت کے لیڈروں کو توفیق دے کہ وہ انصاف کا راستہ اپنائیں اور اقوام متحدہ کی قرار دادوں کے مطابق کشمیر میں رائے شماری کرانے پر آمادہ ہو جائیں"۔

یہ سن کر انور علی کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر اخبار اٹھاتے ہوئے بولا "دادا جان، میں تو اکثر یہ سوچا کرتا ہوں کہ ہم نے پاکستان حاصل کر کے اچھا خاصا جھگڑا مول لے لیا ہے۔ آزادی حاصل کرنے کے بعد اگر یہ ملک ایک ہی رہتا تو اس قسم کے خطرے پیدا ہی نہ ہوتے"۔

میجر صاحب نے چونک کر اپنے پوتے کی طرف دیکھا اور ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولے "بیٹے، تم نے جو

کچھ کہا یہ تمہاری بات نہیں لگتی۔ سچ بتاؤ یہ پٹی تمہیں کس نے پڑھائی ہے؟ یہ تو ہمارے دشمنوں کا زہریلا پروپیگنڈہ ہے"۔

انور علی معصومیت سے بولا "دادا جان ایسی باتیں تو میرے اکثر ساتھی کرتے رہتے ہیں، بلکہ ان میں سے بعض تو یہ بھی کہتے ہیں کہ اس آزادی کے مقابلے میں وہ زمانہ کہیں اچھا تھا جب انگریز اس ملک پر حکومت کر رہے تھے"۔

"اور تم ان باتوں کو ٹھیک سمجھتے ہو؟" اب میجر صاحب کے لہجے میں بہت تلخی تھی۔ "سنو انور علی، آئندہ تم ایسے کسی لڑکے سے بات بھی نہ کرنا۔ یہ وہ بے غیرت لوگ ہیں جنہیں نہ پاکستان کی برکتوں کا علم ہے اور نہ آزادی کی عظمتوں کا۔ یہ وہ جانور ہیں جنہیں ہری گھاس زندگی کی سب سے بڑی نعمت لگتی ہے۔ چاہے ان کی گردن موٹے رسے ہی سے بندھی ہوئی کیوں نہ ہو۔ پیارا وطن پاکستان دے کر خدا نے ہم پر بہت بڑا احسان کیا ہے بیٹے۔ اور آزادی تو اس کی عطا کی ہوئی ایسی نعمت ہے کہ ہم اس کا شکر ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ جو اس کی قدر نہیں کرتے، انہیں گندی نالی کے کیڑے سمجھو، جنہیں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ خوش بو کیا ہے"۔

"لیکن دادا جان، مجھے تو یوں لگتا ہے کہ اگر ہم ملک تقسیم نہ کراتے تو زیادہ فائدے میں رہتے" انور نے کہا۔

"بالکل نہیں بیٹے" میجر صاحب نے بہت اعتماد سے کہا۔ "ہمارے محترم راہ نماؤں نے پاکستان کا مطالبہ یوں ہی جذبات سے مغلوب ہو کر نہ کیا تھا بلکہ بہت غور کرنے کے بعد کیا تھا۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے بعد جس قوم کے ساتھ ہمیں اکٹھے رہنا تھا اس کی نیت ہم مسلمانوں کے بارے میں بہت خراب تھی۔ شاید تم یہ جانتے ہو گے کہ ہمارے تقریباً سارے بڑے لیڈر کانگریس میں شامل رہے تھے۔

مولانا محمد علی جوہر، ان کے بھائی مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خاں، مولانا حسرت موہانی، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، خود قائداعظم محمد علی جناح، ان سبھی نے یہ کوشش کی تھی کہ ہندو اور مسلمان مل کر آزادی کی جنگ لڑیں اور جب ملک آزاد ہو جائے تو بھائیوں کی طرح مل جل کر عزت کی زندگی گزاریں، لیکن بدقسمتی سے ہندوؤں نے یہ بات دل سے نہ مانی۔ وہ کچھ دن تو ہندو مسلم بھائی بھائی کا نعرہ لگانے میں مسلمانوں کے ساتھ رہے، لیکن جیسے ہی یہ یقین ہوا کہ انگریز یہ ملک چھوڑ کر چلے جائیں گے، ہندو اپنی حکومت قائم کرنے کی کوششوں میں لگ گئے"۔

"دادا جان، کیا اس کا کوئی ثبوت بھی ہے؟" انور علی نے سوال کیا۔

"ایک نہیں ہزاروں ثبوت ہیں بیٹے" میجر صاحب سنبھل کر بیٹھ گئے اور اپنی عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے بولے "ہندوؤں کے بدنیت ہونے اور خالص اپنی حکومت قائم کرنے کے ارادے کا پہلا ثبوت تو یہ سامنے آیا کہ انہوں نے آزادی کی جنگ جیتنے سے بہت پہلے 1867ء میں اردو کی جگہ ہندی زبان کو سرکاری زبان بنانے کی تحریک شروع کی۔ اردو ایک ایسی زبان ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول سے بنی تھی۔ مسلمانوں کی اپنی زبان تو فارسی تھی۔ ہندوؤں نے ہندی کو سرکاری زبان بنانے پر اصرار کیا تو اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ وہ اتحاد نہیں چاہتے، بلکہ اپنا غلبہ چاہتے ہیں"۔

"تو کیا وہ اپنی اس کوشش میں کام یاب ہو گئے؟" انور علی نے سوال کیا۔

"بالکل کام یاب ہو گئے۔ 1900ء میں یو پی (جسے اب اتر پردیش کہا جاتا ہے) کے گورنر انٹونی میکڈانلڈ نے ان کا یہ مطالبہ مان لیا اور دیوناگری رسم الخط میں ہندی کو سرکاری زبان کا درجہ دے دیا۔ یہ بات کیسی خراب تھی، اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ جب یہ فیصلہ ہوا تو مسلمانوں کے محترم لیڈر سر سید احمد خاں نے صاف لفظوں میں کہا۔ "اب یہ دونوں قومیں مل جل کر زندگی نہ گزار سکیں گی"۔ ان کی یہ بات بالکل سچ نکلی۔ کچھ اور آگے چل

کر ہندوؤں کے ایک طبقے نے صاف لفظوں میں یہ کہنا شروع کر دیا کہ انگریزوں کی طرح مسلمان بھی اس ملک کے اصلی باشندے نہیں ہیں۔ انہیں یا تو اس ملک سے نکل جانا چاہیے یا ہندو بن جانا چاہیے" میجر صاحب ذرا رک کر کچھ اور کہنا چاہتے تھے کہ انور علی نے ان کی بات کاٹی۔

"لیکن دادا جان' یہ باتیں تو کچھ احمق قسم کے ہندو کرتے تھے۔ ہندوؤں کے اونچے درجے کے لیڈر مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لعل نہرو وغیرہ تو برابر یہ کوشش کر رہے تھے کہ ہندو اور مسلمان اکٹھے رہیں۔ میں نے سنا ہے مہاتما گاندھی تو ہندوؤں اور مسلمانوں کو بھارت ماتا کی دو آنکھیں کہتے تھے؟"۔

میجر صاحب کسی قدر ناراض ہو کر بولے "یہ سب دھوکہ بازی تھی بیٹے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب ہندوؤں نے شدھی' یعنی مسلمانوں کو ہندو بنانے اور سنگھٹن' یعنی سب ہندوؤں کو اکٹھا کرنے کی تحریک شروع کی تو انہی مہاتما گاندھی نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی' بلکہ ہندی زبان کو ترقی دینے کا کام تو خود اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ انہوں نے ایک انجمن بنائی اور بڑے بڑے سیٹھوں' ساہوکاروں سے بھاری رقمیں لے کر ہندی زبان کے اسکول کھلوائے اور نمایاں کام یاتی حاصل کرنے والے طالب علموں کو انعامات اور وظیفے دینے کا انتظام کیا' بلکہ اس سے بھی زیادہ خراب بات یہ کی کہ جب نادان ہندوؤں نے اسلام کے خلاف کتابیں شائع کرنے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنے کا سلسلہ شروع کیا تو گاندھی جی نے اسے بھی کوئی خاص برا کام نہ جانا"۔

"کیا دادا جان ہندوؤں نے کبھی یہ حرکت بھی کی تھی؟" انور علی نے بہت حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں بیٹے ایسا ہوا تھا"۔ میجر صاحب نے بہت افسردہ ہو کر کہا "کہا جاتا ہے کہ ان احمق ہندوؤں نے ایک وفد یہ معلوم کرنے کے لیے اسپین بھیجا تھا کہ وہاں سے مسلمانوں کو کس طرح نکالا گیا تھا اور پھر اس ملک کے عیسائیوں کی طرح انہوں نے یہاں یہ تحریک شروع کی تھی۔ خاص ہمارے شہر لاہور میں رنگیلا رسول کے نام سے ایک کتاب شائع کی گئی تھی اور اس کے ناشر راج پال کو ایک مسلمان نوجوان غازی علم دین نے جہنم رسید کیا تھا"۔

"جی دادا جان' مجھے یہ بات معلوم ہے' غازی علم دین شہید کا مزار لاہور کے قبرستان میانی صاحب میں ہے" انور علی نے جوش بھری آواز میں کہا۔

میجر صاحب افسردہ ہو کر بولے "یہ نہایت ہی بری حرکت بہت سے ہندوؤں نے کی اور مسلمانوں نے انہیں جہنم میں پہنچایا۔ ایک ہندو سوامی شردھانند نے دہلی میں ایسی ہی بکواس کی تو ایک کاتب غازی عبدالرشید نے اسے قتل کر دیا۔ اس پر گاندھی جی نے اپنے اخبار ہریجن میں لکھا "اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو تشدد پر اکساتا ہے" حال آں کہ انہیں یہ لکھنا چاہیے تھا کہ شردھانند نے ایک غلط کام کیا تھا جس کی اسے سزا ملی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کے اصلی خیالات کیا تھے"۔

دادا جان' اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ ہندو واقعی مسلمانوں کے دوست نہ تھے اور یہ بات ضروری ہو گئی تھی کہ جب ملک آزاد ہو تو مسلمانوں کو ان کی اکثریت کے علاقوں میں آزادی سے زندگی گزارنے کا حق دیا جائے"۔ انور علی اب بہت ہشاش نظر آ رہا تھا۔

میجر صاحب نے اسے خوش دیکھا تو مسکراتے ہوئے بولے "خدا کا شکر ہے ہمارے بیٹے کی سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ مسلمانوں نے پاکستان کے نام سے ایک الگ ملک کیوں بنایا' لیکن ہمارا خیال ہے صرف یہ سمجھنا ہی کافی نہیں' بلکہ ضروری بات یہ ہے کہ اپنے آپ کو اپنے پیارے وطن کی حفاظت کے قابل بنایا جائے' اور تم بچے یہ کام اس طرح کر سکتے ہو کہ خوب شوق سے علم حاصل کرو اور ہر قسم کی برائیوں سے دور رہ کر سچے مسلمان بنو' پاکستان زندہ باد۔ "اسلام پائندہ باد" انور علی کی آواز اپنے دادا جان کی آواز میں شامل تھی۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

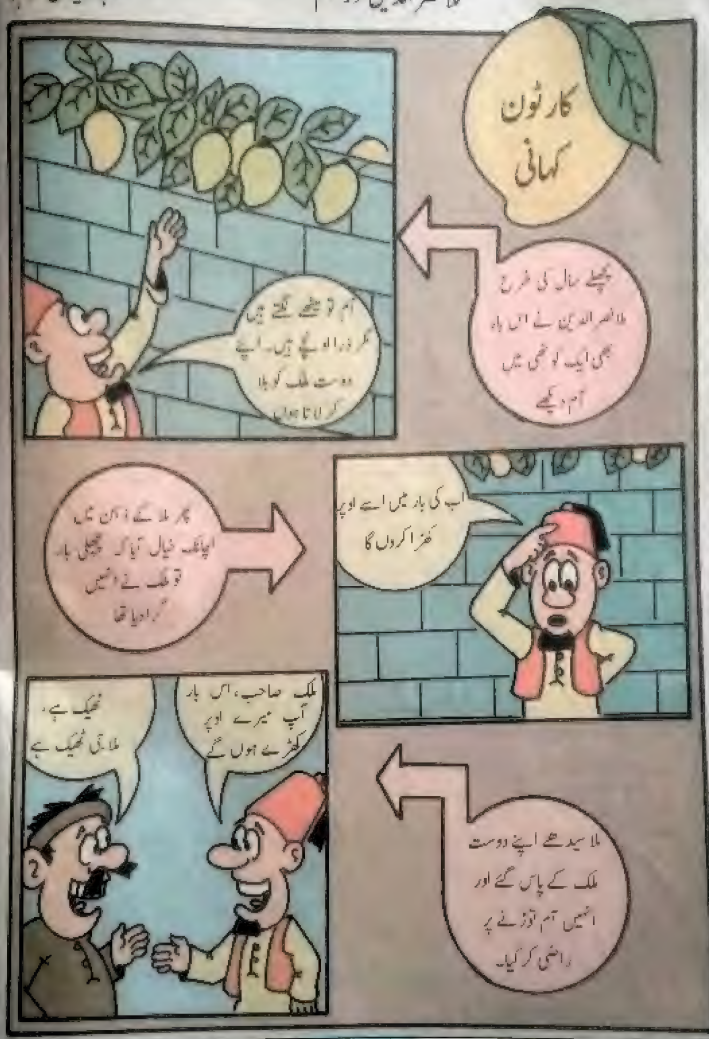

کارٹون کہانی
پچھلے سال کی طرح ملا نصر الدین نے اس بار بھی ایک کوٹھی میں آم دیکھے
آم تو میٹھے لگتے ہیں مگر ذرا اونچے ہیں۔ اپنے دوست ملک کو بلا کر لاتا ہوں
اب کی بار میں اسے اوپر کھڑا کروں گا
پھر ملا کے ذہن میں اچانک خیال آیا کہ پچھلی بار تو ملک نے انہیں گرا دیا تھا
ملا سیدھے اپنے دوست ملک کے پاس گئے اور انہیں آم توڑنے پر راضی کر لیا۔
ملک صاحب، اس بار آپ میرے اوپر کھڑے ہوں گے
ٹھیک ہے، ملا جی ٹھیک ہے

پھر ملک صاحب ملا کے اوپر کھڑے ہو گئے مگر ملا تو اتنا وزن برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا ملک صاحب سے لیے گئے۔
یار ملک جلدی کرو نا میری تو ٹانگیں کانپ رہی ہیں
پھر وہی ہوا جو چوری چھپے آم توڑنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔
اوئے ملک میں تو گیا
بے چارے ملا دھڑام سے زمین پر آ گرے اور ملک صاحب آموں سمیت مزے سے ملا پر بیٹھے تھے۔
یار ملک اٹھو .... اٹھو
نہیں بھائی میں تو آم کھا کر ہی اٹھوں گا۔

"گندگی اور غلاظت سے بچاؤ" بچوں کے لیے درس قرآن میں ہمارا آج کا موضوع ہے۔ موضوع کی اہمیت کو ہمارے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ کی متعدد حدیثوں میں بڑی خوب صورتی سے واضح کیا گیا ہے۔ اسی طرح قرآن حکیم کی کئی آیات میں بھی گندگی کی برائیوں سے بچنے کے فائدوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مثلاً سورہ نمبر 74 کی پانچویں آیت ان دو الفاظ میں مشتمل ہے

"گندگی سے دور رہو!"

غلاظت اور گندگی سے بچنا بہت ضروری ہے۔ اسی طرح اپنے سارے ماحول کو غلاظت اور تعفن سے پاک رکھنا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ اسلام اس بات پر بار بار زور دیتا ہے کہ اپنی ذاتی زندگی اور سارے معاشرے کو ہر قسم کی گندگی سے پاک رکھا جائے۔

یہ بات کس قدر افسوس ناک ہے کہ آج طرح طرح کی خطرناک غلاظتوں اور گندگیوں نے ہمارا محاصرہ کر رکھا ہے۔ پاکستان جسے اسلام کا مضبوط اور خوب صورت قلعہ ہونا چاہیے تھا، ہر قسم کی غلاظتوں کی بدنما تصویر پیش کر رہا ہے۔ ہمارے گاؤں، گلیاں اور محلے کوڑے کرکٹ کے متعفن ڈھیروں کی بدنما تصویر بن چکے ہیں۔ غلاظت اور گندگی کے غلبے سے ہمارے ہاں صحت عامہ کا معیار بھی تشویش ناک صورت اختیار کر چکا ہے۔

ماحولی غلاظت کے علاوہ ہمارے ہاں تمدنی اور ثقافتی غلاظت بھی زوروں پر ہے۔ غلاظت اور تعفن اب گندی نالیوں اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ ہماری ساری زندگی اور سارا معاشرہ اس کی لپیٹ میں آچکا ہے۔ مغرب کا نیلی وژن عموماً اور ہندوستان کا خصوصاً اپنے لچر اور غلیظ پروگراموں میں بہت بدنام ہوا کرتے تھے۔ مگر اب تو ہمارا نیلی وژن اور سنیما بھی غیر اسلامی اور غیر معیاری پروگراموں کی پیش کش میں کافی خود کفیل ہو گیا ہے۔ ہمارے رسالے اور اخبارات بھی طرح طرح کی غلاظتوں اور بے حیائیوں کی ترجمانی میں دن رات مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ ہماری سیاست تو آلودگی کا مجسمہ بن چکی ہے۔ ہمارے محترم ترین قومی اداروں میں آئے دن جو غلیظ کارروائیاں رونما ہوتی رہتی ہیں ان سے سارے ملک کی تمدنی فضا مزید بدبو دار ہو گئی ہے۔

غلاظت اور گندگی کی اس یلغار سے بچنا بے حد ضروری ہے۔ فوری بچاؤ کے بغیر ذلت و تنزل کے چنگل سے نکلنا اور تعمیر و ترقی سے ہم کنار ہونا ناممکن ہے۔ اسلام اور وطن سے محبت رکھنے والے ہر چھوٹے بڑے کو غلاظت اور تعفن کے خلاف منظم جہاد میں شامل ہو جانا چاہیے۔

چار بڑوں کا اجلاس شروع ہوئے 3 گھنٹے گزر چکے تھے لیکن یہ اجلاس کسی طرح ختم ہونے پر ہی نہ آ رہا تھا۔ کمرا اندر سے بند تھا اور ایکس چینج والوں سے کہ دیا گیا تھا کہ چار بڑوں میں سے کسی کا بھی ٹیلی فون آئے تو بتا دیں کہ اس وقت بات نہیں ہو سکتی۔

اس کمرے میں جہاں اجلاس ہو رہا تھا' ملک کی چند بہت زیادہ قیمتی چیزیں رکھی گئی تھیں۔ جن میں جواہرات بھی تھے' بیش قیمت تصویریں بھی اور ایسے کاغذات بھی جو ملک کے اہم راز چھپائے ہوئے تھے۔ چار بڑے اور ان کے عملے کے لوگ اس کمرے کو "خزانہ" کہتے تھے۔

چار بڑوں میں ایک سائنس دان تھا' جسے اصلی نام کے بجائے "پروفیسر" کہا جاتا تھا۔ دوسرا پرانے زمانے کی چیزوں یعنی نوادرات کا ماہر تھا' جسے "ایکسپرٹ" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ تیسرا پولیس کا ایک بڑا افسر تھا جو "اوفیسر" کہلاتا تھا اور چوتھا چار بڑوں کی کمیٹی کا سربراہ تھا جسے سب لوگ "سینئر" کہتے تھے۔

سینئر نے اپنے تینوں ساتھیوں کو بتایا۔ "وزارت داخلہ نے طے کیا ہے کہ "خزانہ" پر سے محافظ ہٹا لیے جائیں اور اب صرف باہر پہرا رکھا جائے۔ کیوں کہ اب....."

اوفیسر نے سینئر کی بات کاٹتے ہوئے کہا "عجب فیصلہ ہے اور تم نے یہ فیصلہ مان لیا؟"

سینئر نے چڑ کر کہا "یار تم سے کتنی بار کہا ہے کہ پوری بات سن کر بولا کرو۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ تم نے بات کاٹنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ اچھا اب غور سے سنو۔ "خزانہ" پر اب ایک نیا حفاظتی انتظام کیا جا رہا ہے"۔

اوفیسر جیسے حیرت سے اچھل پڑا اور بولا "اچھا' نیا حفاظتی انتظام؟ وہ کیا ہے؟ جلدی سے بتاؤ"۔

سینئر نے اپنا سر پکڑ لیا اور کہنے لگا "اف میرے خدا! میرے اوپر رحم کر۔ یار کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ اپنا بھی وقت ضائع کر رہے ہو اور دوسروں کا بھی"۔

اوفیسر شرمندہ ہونے کے بجائے ہنسا اور بولا "سینئر! جب تم اتنا آہستہ آہستہ بات کرو گے تو بیچ میں بولنا ہی پڑے گا۔ اچھا اب وعدہ کرتا ہوں کہ اپنے ہونٹ سی لوں گا"۔

یہ کہ کر اوفیسر نے دونوں ہاتھوں سے اپنے ہونٹوں کو دبا لیا اور سینئر نے کہا "یہ ہوئی نا اچھے بچوں والی بات۔ اچھا اب تم سب غور سے سنو۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہر چیز بدل رہی ہے۔ گھروں' دفتروں اور کارخانوں وغیرہ میں حفاظتی نظام بھی خاصا بدل چکا ہے اور بہت سی تبدیلیاں آنے والی ہیں۔ ایک امریکی کمپنی نے 1995ء میں ایک تالا بنانا شروع کیا جو اب تیار ہوا ہے۔ اسے آپ جادو تو نہیں کہ سکتے۔ البتہ یہ ٹیکنالوجی کا کمال یقیناً ہے کہ آپ کے گھر' دفتر غرض کہ ہر جگہ کا دروازہ آپ کی آواز سن کر کھل سکتا ہے۔ لیکن یہ تالا ہے بہت مہنگا"۔

اوفیسر سے اب خاموش نہ رہا گیا' وہ بولا "سینئر! یہ تو علی بابا چالیس چور کی کہانی والی بات ہو گئی کہ ادھر "کھل جا سم سم" کہا اور ادھر خزانے کا دروازہ کھل گیا"۔

سینئر نے چند سکنڈ کے بعد پھر بات شروع کی "اس "آواز تالے" میں دو چیزیں اہم ہیں۔ ایک آواز اور دوسری ذاتی کوڈ ورڈ۔ آپ جب دروازے پر پہنچیں گے اور کوڈ ورڈ کہیں گے۔ اس تالے کا کام یہ ہو گا کہ وہ آپ کی آواز کو پہچانے۔ آپ نے جو کوڈ ورڈ اپنی آواز میں کہا ہے' اسے چیک کرے گا اور اگر آواز اور کوڈ صحیح ہیں تو فوراً کھل جائے گا۔ اس عمل میں مشکل سے ایک آدھ سکنڈ لگے گا"۔

اس بار پروفیسر نے سوال کیا "تو مطلب یہ ہوا کہ اسے صرف وہ لوگ استعمال کر سکیں گے جنہیں تالے کا کوڈ ورڈ معلوم ہو گا؟"

سینئر نے گردن ہلائی اور بولا "ہاں جتنے لوگ اسے استعمال کریں گے یا یوں کہو کہ جتنے لوگوں کو یہ کمپیوٹر تالا استعمال کرنے کی اجازت ہو گی ان کی آواز کا نمونہ کمپیوٹر میں داخل کر دیا جائے گا اور

کوڈ ورڈ بھی پہلے سے کمپیوٹر میں موجود ہوگا تاکہ جب وہ بولیں تو کمپیوٹر فوراً پہلے سے داخل کئے گئے نمبر اور آواز سے اس کا مقابلہ کرے اور ایک سکنڈ میں پتا لگالے کہ جو شخص تالا کھولنا چاہتا ہے وہ اصلی ہے یا نقلی"۔

ایکسپرٹ نے پوچھا "اچھا سینئر یہ بتاؤ کہ اگر کسی شخص کو دوسرے کا کوڈ ورڈ پتا چل جائے تو پھر تو وہ دوسرے کا تالا کھول لے گا؟"

سینئر نے فوراً جواب دیا "ہرگز نہیں میں نے کہا تھا کہ تالا کھلنے میں آواز کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ بلکہ سب سے زیادہ اہمیت آواز کی ہے۔ فرض کرو کہ کسی شخص کو تمہارے تالے کا کوڈ ورڈ کسی طرح معلوم ہو جائے لیکن وہ شخص تمہاری آواز تو نہیں چرا سکتا"۔

ایکسپرٹ نے بہت زور دے کر کہا "لو آواز بنا لینا کیا مشکل ہے۔ بے شمار لوگ دوسروں کی نقل اتارنے اور آواز بنانے میں مہارت رکھتے ہیں"۔

سینئر نے ہنستے ہوئے کہا "یار مانا کہ تم نوادرات کے ماہر ہو لیکن اندازہ یہ ہوا کہ تمہاری عام معلومات صفر ہیں"۔ پھر سینئر نے دیکھا کہ ایکسپرٹ کچھ سنجیدہ ہو رہا ہے تو اس نے جلدی سے کہا "دراصل کہا یہ جاتا ہے کہ جس طرح دو آدمیوں کی انگلیوں کے نشان یا لکیریں بالکل ایک جیسی نہیں ہو سکتیں اسی طرح دو آدمیوں کی آوازیں سو فی صد ایک جیسی نہیں ہوتیں۔ لہٰذا کوئی شخص دوسرے کی آواز بنانے کی خواہ کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرے وہ کمپیوٹر کو دھوکا نہیں دے سکتا"۔

سینئر نے آخر میں یہ بھی بتایا کہ چند روز تک یہ انوکھا تالا "خزانہ" میں لگا دیا جائے گا اور اس میں چار بڑوں کی آواز کے نمونے اور ان کے ذاتی کوڈ ورڈ داخل کر دیے جائیں گے۔ ان چار کے علاوہ کوئی پانچواں شخص اس تالے کو نہیں کھول سکے گا۔ اور پھر "خزانہ" میں آواز تالا لگ گیا۔ چاروں بڑے اس تالے کی کارکردگی سے بہت خوش تھے۔

جس شہر میں "خزانہ" تھا اس شہر میں مارچ کا مہینا شروع ہوتے ہی ایسے حسین اور رنگ برنگے پھول کھلتے کہ ان پر سے نظر ہٹانا مشکل ہو جاتا۔ مارچ اور اپریل کے مہینے میں بے شمار سیاح دوسرے شہروں اور دوسرے ملکوں سے پھولوں والے شہر میں آتے اور خوب سیر کرتے تھے۔ پھولوں کی وجہ سے اس شہر کا نام ہی "فلاور ویلی" رکھ دیا گیا تھا۔

کئی سال سے پھولوں کے موسم میں فلاور ویلی میں ایک کانفرنس بھی ہوتی تھی جس میں مختلف ملکوں کے سائنس دان شرکت کرتے تھے۔ کانفرنس میں جو سائنس دان چاہتا اپنی نئی تحقیق کے بارے میں مضمون پڑھتا۔ پھر یہ مضمون رجسٹر کر لیا جاتا اور اس پر اس سائنس دان اور اس کے ملک کے حق کو مان لیا جاتا۔ یہ طریقہ کئی برسوں سے رائج تھا۔

چار بڑوں میں شامل سائنس دان یعنی "پروفیسر" نے کچھ دن پہلے فصلوں کے بارے میں اپنی تحقیق مکمل کی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر ان کے طریقے پر عمل کیا جائے تو مصنوعی کھاد اور کیڑے مار دوائیں استعمال کیے بغیر فصل چار گنا بڑھ جائے گی اور یہ فصل چوں کہ قدرتی طریقوں سے اگائی جائے گی لہٰذا یہ صحت کے لیے بھی بہت فائدہ مند ہوگی۔ پروفیسر نے اعلان کیا کہ وہ کانفرنس میں اپنے اس نئے طریقے کے بارے میں بتائیں گے۔ لوگوں کو یقین تھا کہ کھیتی باڑی کا یہ نیا طریقہ ملک کو بہت فائدہ پہنچائے گا لہٰذا سب انتظار کر رہے تھے کہ یہ طریقہ جلد رائج ہو۔

اکیسویں صدی کو شروع ہوئے تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا۔ فلاور ویلی میں پھولوں کا موسم شروع ہو گیا۔ شہر میں بڑی رونق تھی۔ پھر کانفرنس کی تاریخ قریب آگئی۔ یہ تین دن کی کانفرنس تھی اور چوں کہ پروفیسر کا تعلق میزبان ملک سے تھا لہٰذا انہیں اپنا مضمون تیسرے یعنی آخری دن پڑھنا تھا۔ پہلے مہمانوں کی باری تھی۔ مہمانوں میں ڈاکٹر ویتواو گاچی بھی شامل تھے جو ایک دوست ملک کے مشہور سائنس دان تھے۔ ان کی باری پہلے دن تھی۔

انہوں نے اپنا مضمون شروع کیا تو پروفیسر انہیں حیرت سے تکنے لگا۔ جتنا جتنا وہ پڑھتے جاتے اتنی ہی پروفیسر اور اس کے ساتھی سائنس دانوں کی حیرت بڑھتی جاتی تھی۔ وہ سب سخت پریشان تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

کانفرنس کا پہلا دن ختم ہوا تو رفتہ رفتہ یہ خبر پھیلنا شروع ہو گئی

کہ فلاوروپلی کے سائنس دانوں نے فصلوں کے بارے میں تحقیق کر کے جو مقالہ تیار کیا تھا وہ کسی طرح ویتواوگاچی کے ہاتھ لگ گیا اور انہوں نے اسے اپنے نام سے پڑھ دیا۔ فلاوروپلی کے سائنس دانوں کے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں تھا جس سے وہ یہ ثابت کر سکتے کہ یہ تحقیق ان کی ہے اور اسے چرایا گیا ہے۔ ویتواوگاچی کا تعلق ایک دوست ملک سے تھا لہٰذا حکومت یہ نہیں چاہتی تھی کہ کسی ثبوت کے بغیر کوئی بات ایسی کہی جائے جس سے دونوں ملکوں کے تعلقات خراب ہوں۔ حکومت نے بالکل خاموشی اختیار کر لی بلکہ یہ کوشش بھی کی کہ یہ خبر زیادہ نہ پھیلے۔ لیکن پروفیسر اور اس کے ساتھی سائنس دان بہت رنجیدہ تھے کہ ان کی محنت بے کار گئی اور نام کوئی اور کما گیا۔ ساتھ ہی سب حیران تھے کہ ایک دوست ملک کے سائنس دان نے ایسا کیوں کیا اور یہ مقالہ جو "خزانہ" میں بند تھا ڈاکٹر ویتواوگاچی کے ہاتھ کیسے لگ گیا؟ "خزانہ" کی چابی چار بڑوں کے پاس تھی اور کوئی اور اسے کھول ہی نہیں سکتا تھا۔

حکومت نے ظاہر میں تو خاموشی اختیار کر لی لیکن خفیہ تحقیقات شروع کر دی گئیں کہ چار بڑوں میں سے کس نے یہ غداری کی ہے۔ تحقیقات کے انچارج چیف جج نے پہلے "خزانہ" کی عمارت کا ایک ایک کونا دیکھا' پھر آواز تالے کے بارے میں پوری معلومات حاصل کیں اور جتنی چیزیں وہاں رکھی تھیں انہیں بار بار دیکھا۔ اس کے بعد جج نے چار بڑوں سے ملاقات کی اور ان کے بیانات ریکارڈ کیے۔ کئی دن گزر گئے لیکن جج نے کوئی فیصلہ نہ دیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اسے کسی بات کا انتظار ہے۔ دو دن بعد ایک شخص کی جج سے ٹیلی فون پر کچھ بات ہوئی اور پھر وہ ملنے کے لیے آیا۔ جج نے اس شخص کو ساتھ لے کر ایک بار پھر "خزانہ" کا دورہ کیا۔ اس شخص کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ یہ کون ہے۔ یہ شخص کئی بار جج سے ملاقات کے لیے آیا لیکن کوئی اس کے بارے میں نہ جان سکا۔ صرف اتنا اندازہ ہو سکا کہ وہ غیر ملکی ہے۔ دو دن اور گزر گئے اور پھر جج نے دن اور وقت مقرر کر کے حکومت کے چند بڑے عہدے داروں اور چار بڑوں کو "خزانہ" میں اکٹھا ہونے کو کہا۔

مقررہ وقت پر سب لوگ جمع ہوئے تو انہیں یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ جج کے ساتھ وہ غیر ملکی بھی بیٹھا تھا۔ جج نے اس کا کسی سے تعارف نہیں کرایا اور نہ ہی یہ بتایا کہ اس نے سب کو کیوں بلایا ہے۔ کچھ دیر بالکل خاموشی رہی اور پھر جج نے غیر ملکی اجنبی سے کچھ کہا۔ اجنبی نے اونچی آواز میں بولنا شروع کیا۔ "اسکائی لارک ایکس 600 ذرا میرے قریب آئیں۔ جلدی کریں"۔

سب لوگوں کی نظریں دروازے کی طرف گئیں لیکن کوئی بھی اندر نہ آیا۔ اجنبی نے جیب سے ریموٹ کنٹرول نکالتے ہوئے کہا "اوہ! یہ میری غلطی تھی"

یہ کہ کر اس نے ریموٹ کنٹرول کا ایک بٹن دبایا اور پھر اسکائی لارک ایکس 600 کو آواز دی۔ لوگوں کی نظریں پھر دروازے کی طرف گئیں لیکن اب بھی کوئی کمرے میں داخل نہ ہوا۔ لیکن کونے میں رکھا ہوا ٹیلی وژن سیٹ اپنی لکڑی اور لوہے کی دو ٹانگوں پر چلتا ہوا اجنبی کے پاس آن کھڑا ہوا۔ لوگوں کے منہ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے۔ پھر کسی نے کہا "یہ کس طرح ممکن ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا"۔

دوسری آواز آئی "میں سخت حیران ہوں یہ ماجرا کیا ہے؟"

غیر ملکی اجنبی نے بولنا شروع کیا "میرا خیال ہے کہ اس میں اتنا حیران نہیں ہونا چاہیے۔ ٹیکنالوجی کہیں سے کہیں پہنچ چکی ہے۔ البتہ حیران تو آپ لوگ اب میری باتوں پر ہوں گے۔ ذرا میری گفت گو کو غور سے سنئے۔ یہ ٹیلی وژن سیٹ جو آپ میرے قریب دیکھ رہے ہیں اسے کیلی فورنیا کے ایک طالب علم برائن ایلیٹ نے ایجاد کیا اور اس کا نام اپنی ماں رکھا تھا۔ اس کا پہلا کمال تو یہ ہے کہ اگر آپ اسے آواز دیں تو یہ آپ کی آواز کی سمت میں چلنے لگے گا۔ دوسری بات یہ کہ جب رات کو یا کسی بھی وقت آپ اس پر پروگرام دیکھ چکیں اور اس کا سوئچ دبا دیں تو یہ آپ کے گھر یا دفتر میں ادھر ادھر گھوم کر چوکی داری کا کام کرے گا۔ اور اگر آپ کے سوتے میں کوئی اجنبی شخص گھر میں داخل ہو تو اس کا الارم بجنے لگے گا۔ اس میں ایک کیمرا بھی لگا ہے' چھوٹا سا کیمرا جس کی طرف عام طور سے لوگوں کی توجہ نہیں جاتی۔ ایک جاپانی کمپنی کو اس چلتے پھرتے ٹی وی سیٹ کا پتا چلا تو اس نے اسے بہتر بنانے اور اس میں کچھ اور کمال پیدا کرنے کی کوشش کی"۔

سینیٹر نے پوچھا "کیا آپ یہ بتانا پسند کریں گے کہ وہ نئے کمال

کیا ہیں؟"

اجنبی کے بجائے جج نے سینٹر کے سوال کا جواب دیا۔ "یہ صاحب جاپانی کمپنی کے نمایندے ہیں۔ ان کی کمپنی سے ہمارا معاہدہ ہے کہ ہم اس نئے ٹی وی سیٹ کی نئی باتیں فی الحال کسی کو نہیں بتائیں گے۔ البتہ ایک بات میں آپ کو بتائے دیتا ہوں جس کا اس کیس سے گہرا تعلق ہے۔ اب آپ لوگ میری بات غور سے سنیے۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس "خزانہ" میں ہر طرف حفاظتی کیمرے لگے ہوئے ہیں جو آنے جانے والوں کی فلم بناتے رہتے ہیں۔ کچھ دن پہلے ایک ایسا شخص جو "خزانہ" کا آواز تالا کھول سکتا تھا، یہاں آیا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا۔ اس شخص کو یہ معلوم تھا کہ حفاظتی کیمروں کا سوئچ کہاں ہے۔ اس نے یہ سوئچ بند کر دیا تاکہ کیمرے اس کی فلم نہ بنا سکیں۔ پھر اس شخص نے وہ تحقیقی مضمون جو ڈاکٹر اوگاچی تک پہنچا اور انھوں نے اسے اپنے نام سے کانفرنس میں پڑھ دیا "خزانہ" سے نکالا اور اپنے ساتھی کے حوالے کر دیا۔ یہ ساتھی دراصل اوگاچی کا نائب تھا"۔ اتنا کہ کر جج نے ان لوگوں پر نظر ڈالی جو کمرے میں موجود تھے تاکہ ان کی حالت بھانپ سکیں۔ چند سکنڈ کے بعد پروفیسر نے سوال کیا۔

"آپ بجائے اس نئے ٹی وی سیٹ کے حفاظتی کیمروں کی بات کر رہے ہیں۔ ٹی وی سیٹ کا حفاظتی کیمروں سے کیا تعلق ہے؟"

"بہت گہرا تعلق ہے" جج نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور اپنی بات جاری رکھی "بات یہ ہے کہ وہ شخص جس نے ملک سے یہ غداری کی ہے وہ یہ سمجھا تھا کہ حفاظتی کیمرے بند کر کے وہ محفوظ ہو گیا ہے۔ لیکن اس کا یہ خیال غلط تھا۔ دراصل جاپانی کمپنی نے اس ٹی وی اور خزانہ کے درمیان ایک ایسا رابطہ پیدا کر دیا ہے کہ اگر حفاظتی کیمروں کا سوئچ بند کیا جائے تو اس ٹی وی سیٹ کا چور کیمرا خود بخود اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔ یہی ہوا کہ اس شخص نے ادھر حفاظتی کیمروں کا سوئچ بند کیا اور ادھر اس ٹی وی سیٹ کے کیمرے نے فلم بنانا شروع کر دی جو ابھی میں آپ سب کو دکھاتا ہوں"۔

یہ کہ کر جج فلم لانے کے لیے کھڑے ہوئے لیکن اس کے ساتھ ہی پروفیسر ایک طرف لڑھک گیا۔ زہر کی گولی اپنا کام دکھا چکی تھی جو اس نے چپکے سے خود ہی نگل لی تھی۔ پروفیسر کا بے جان جسم غداری اور خودکشی کی علامت بنا زمین پر پڑا تھا۔

وکیل: اچھا تو تمہارا کہنا ہے کہ تم نے چاندی کا کپ دوڑ میں جیتا ہے؟
چور: جی ہاں
وکیل: اس دوڑ میں تمہارے ساتھ اور کون کون تھا؟
چور: بازار کے کچھ لوگ' چار پولیس والے اور دوکان دار
(جانیتا کرسٹل روز کراچی)

استاد (انور سے) "کیا تم نے کبھی ہاتھی کو چائے پیتے ہوئے دیکھا ہے؟"
انور: جی ہاں
استاد "کہاں؟
انور: میں چڑیا گھر میں بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ سامنے سے ہاتھی گزر گیا۔ یوں میں نے چائے پیتے ہوئے ہاتھی کو دیکھا (زاہد جاوید انجم فتح پور)

ایک آدمی نے نیا ملازم رکھا۔ ایک روز اس نے دیکھا کہ وہ بھینس کو بالٹی میں سے دودھ پلا رہا ہے۔ مالک غصے سے بولا "کیا کیا کر رہے ہو؟ دودھ دوہنے کے بجائے الٹا بھینس کو پلا رہے ہو؟"
"دودھ تو میں نے دوہ لیا تھا سرکار! لیکن پتلا بہت تھا۔ میں نے سوچا ایک چکر اور دے لوں" ملازم نے ہاتھ باندھ کر جواب دیا
(سائرہ الطاف لاہور)

ڈاکٹر کے پاس ایک مریض آیا اور کہنے لگا "ڈاکٹر صاحب آپ نے مجھے پہچانا؟"
ڈاکٹر "جی نہیں"
مریض: ڈاکٹر صاحب میں وہی مریض ہوں جسے دو سال پہلے نمونیا ہو گیا تھا اور آپ نے نہانے سے منع کیا تھا۔ میں پوچھنے آیا ہوں کہ کیا میں اب نہا سکتا ہوں"
(صوفیہ اسلم بہاول پور)

ایک حادثے میں زخمی ہونے والے کو ہسپتال لے جایا گیا۔ ڈاکٹر نے اس کی مرہم پٹی کر کے کہا تمہارے زخم زیادہ شدید نہیں ہیں 'تم گھر جا سکتے ہو' لیکن ایک آدھ دن یہاں آرام کر لو' دوسرے دن جب وہ مریض چھٹی لینے ڈاکٹر کے پاس آیا تو ڈاکٹر نے نرس سے کہا: "اسے آپریشن روم میں لے چلو' اس کا آپریشن ضروری ہے"۔
"وہ کیوں؟" زخمی نے پوچھا۔
"مجھے آج کے اخبار میں حادثے کی تفصیل پڑھ کر تمہارے زخموں کی شدت کا احساس ہوا ہے" ڈاکٹر نے جواب دیا (جاوید اقبال ناصر ساہی وال)

ایک موٹے شخص سے اس کے دوست نے پوچھا "آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ تمام موٹے لوگ خوش مزاج ہوتے ہیں۔
موٹے شخص نے خوش مزاجی سے کہا "وجہ صاف ظاہر ہے کہ ہم نہ بھاگ سکتے ہیں نہ لڑ سکتے ہیں"
(نوشین اختر کبیر والا)

مجسٹریٹ (ملزم سے) تم دوٹوک جواب دو کہ تم نے جرم کیا ہے یا نہیں
ملزم: جناب! اگر یہ فیصلہ مجھے ہی کرنا ہے تو آپ اپنا قیمتی وقت کیوں ضائع کر رہے ہیں (طیبہ تحسین ملک وال)

رمیش کا وعدہ

نجمہ معراج

یہ اگست کی ایک روشن صبح تھی۔ رمیش کا والد اٹھا حسب معمول اس نے اپنا بیلچہ اور کوڑے والی ریڑھی پکڑی۔ ابھی وہ باہر دروازے کے پاس ہی گیا تھا کہ اسے لوگوں کے بھاگنے اور شور وغل کی آوازیں آنے لگیں۔ اس نے بیلچہ گھر ہی چھوڑا اور جلدی سے دروازہ کھولا۔ اس کے گھر کے عین سامنے راونامی ایک ہندو کی دکان تھی۔ وہ بھی باہر کھڑا تھا۔ رمیش کے والد نے اس سے پوچھا "کیا بات ہے؟ یہ لوگ کدھر دوڑے جا رہے ہیں؟ اور یہ چیخ پکار کی آوازیں کہاں سے آ رہی ہیں؟"

راو بولا "لالہ! مسلمانوں کا علیحدہ ملک بن رہا ہے۔ چوں کہ یہ علاقہ ہمارے ہندوستان میں شامل ہے اس لئے ادھر سے مسلمان ادھر اپنے ملک 'پاکستان' میں جا رہے ہیں۔ مسلمانوں کا کہنا ہے کہ ہمارے نئے ملک میں سب لوگ آزاد ہوں گے اور سب کے حقوق برابر ہوں گے"۔

یہ بات سنتے ہی رمیش کے باپ کے ذہن میں ایک عجیب و غریب خیال آیا۔ "کیوں نہ میں اپنے رمیش کو پاکستان بھیج دوں۔ ادھر تو ہم کتوں سے بھی بدتر زندگی گزار رہے ہیں۔ ہمارا جرم بس یہ ہے کہ ہم شودر ہیں۔ ادھر تو ہم گندگی اٹھانے اور گٹر صاف کرنے کے علاوہ کوئی کام نہیں کر سکتے۔ نہ ہی ہم کسی اونچی ذات کے ہندو کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا سکتے ہیں۔ اگر ان کی کسی چیز کو ہاتھ لگا دیں تو وہ پلید ہو جاتی ہے۔ وہ ہمیں اچھوت سمجھتے ہیں۔ مگر پاکستان میں تو یقیناً ایسا نہیں ہو گا۔ نہ ذات پات ہو گی، نہ اونچ نیچ، آزادی، خلوص، محبت، پیار... واہ بھئی واہ" وہ یہ سوچتا ہوا خوشی خوشی گھر پہنچا۔ رمیش اس وقت جھاڑو پکڑے اپنی بہن کے ساتھ صفائی کرنے کے جانے کو تیار کھڑا تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کے ہاتھ سے جھاڑو پکڑتے ہوئے کہا "اب تیری کایا پلٹ جانے کا دن آگیا ہے، جھاڑو چھوڑ اور آ میرے ساتھ دوڑ، موقعے سے فائدہ اٹھا اور پاکستان پہنچ جا"۔ یہ کہتے ہوئے اس کے ذہن میں اپنے بچے کا سنہری مستقبل تھا۔

رمیش کو پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ مگر شودر کا بچہ ہونے کی وجہ سے اسے کسی اسکول میں داخلہ نہیں ملا تھا۔ البتہ اس کے محلے میں شوکت نامی ایک مسلمان لڑکا رہتا تھا جو اس سے تین سال بڑا اور آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا۔ رمیش نے اس سے پانچویں کلاس تک کی کتابیں پڑھ لی تھیں۔ وہ اپنے باپ کی پاکستان جانے والی بات سن کر بہت حیران ہوا۔

"کیوں پتاجی، اپنی دھرتی ماتا کو چھوڑ کر کیوں چلا جاؤں؟" رمیش نے کہا۔

"اس لئے کہ ادھر تجھے مسلمان یوں اچھوت نہیں سمجھیں گے اور نہ ہی تجھے علیحدہ برتنوں میں کھلائیں گے۔" "بیٹے تو ہی بتا کیا کوئی باپ بیٹے کو اپنے سے جدا کرنے کا سوچ سکتا ہے؟ یقیناً نہیں،

نہیں۔ مگر میں یہ کام اپنے دل پر جبر کر کے کر رہا ہوں۔ اس لیے کہ اب ساری زندگی میں اکٹھے رہنے سے مجھے تیری جدائی برداشت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تو ادھر بہت اچھی زندگی گزارے گا"۔

"نہیں پتا جی میں آپ کو اور دھرتی ماتا کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا" رمیش نے کہا۔

"تو خود ہی تو مجھے کہتا تھا کہ پتا جی اس زندگی سے تو موت اچھی ہے' جب سب لڑکے کھیل رہے ہوتے ہیں تو میں پاس کھڑا ہو کر حسرت سے دیکھتا رہ جاتا ہوں۔ اگر کبھی ساتھ کھیلنے کی خواہش ظاہر کرتا ہوں تو سب لڑکے کہتے ہیں نہ یار یہ شودر ہے۔ اس کو اپنے ساتھ نہ کھلنے دینا۔ تو بیٹا یہ باتیں سن کر ہی تو میں نے تمہیں پاکستان بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے۔ جلدی کرو مسلمانوں کے قافلے پاکستان جا رہے ہیں' تم بھی ان کے ساتھ ہو لو"۔

وہ جلدی سے اپنے باپ کے گلے ملا اور پاکستان جانے کے لئے نکل پڑا۔ پھر وہ کڑے سفروں میں سے گزرتا ہوا' قتل و غارت اپنی آنکھوں سے دیکھتا' تھکا ماندہ پاکستان پہنچ گیا۔ اب اسے سخت بھوک لگی تھی اور ایک بازار میں وہ ایک بہت بڑی کوٹھی کے پاس سے گزر رہا تھا۔

اس کے سر پہ بالوں کی ایک لٹ تھی جو اس کی گردن کو چھو رہی تھی۔ باقی سر کے بال چھوٹے چھوٹے تھے۔ جوں ہی وہ ایک کوٹھی کے گیٹ کے آگے سے گزرا۔ دو عورتیں گیٹ میں سے باہر آئیں۔ اسے دیکھ کر ایک نے کہا "یہ بچہ ہندوؤں کا لگتا ہے"۔

دوسری نے کہا "باجی یہ تو لڑکھڑا رہا ہے"۔

اتنے میں پہلی عورت رمیش کی طرف دیکھ کر کہنے لگی "او بچے! کہاں سے آئے ہو؟"۔

اس نے جلدی سے کہا "میں ہندوستان سے آیا ہوں۔ میں شودر ہوں' ہندو مجھ سے نفرت کرتے تھے۔ میرے پتا جی نے کہا تھا کہ تم پاکستان چلے جاؤ۔ وہاں تمہیں شاید کوئی اچھی نوکری مل جائے"۔ ساتھ ہی اس نے کانپتی زبان سے کہا "بیگم صاحبہ' مجھے بھوک لگی ہے بھگوان کے واسطے کچھ کھانے کو دو"۔

وہ عورت بولی "آمنہ' جاؤ چنگیر میں دو روٹیاں اور دال کی کٹوری ڈال کر اس بچے کو دو"۔

اس عورت کی بیٹی آمنہ گھر سے یہ چیزیں لینے چلی گئی۔ رمیش نے پھر بیگم صاحبہ سے کہا "بیگم صاحبہ' مجھ سے کوئی کام کروا لیا کریں اور مجھے اپنے پاس رکھ لیں۔ بس دو وقت کی روٹی دے دیا کرنا"۔

"پہلے ایک وعدہ کرو' کام چھوڑ کر بھاگو گے تو نہیں" بیگم نے کہا۔

رمیش کہنے لگا "نہیں بیگم صاحبہ ہرگز نہیں' میں پکا وعدہ کرتا ہوں کہ ہمیشہ آپ کے ہاں ہی کام کرتا رہوں گا"۔

اب بیگم صاحبہ نے اسے غسل خانے اور بیت الخلا صاف کرنے اور کوڑا کرکٹ پھینکنے کا کام سونپ دیا۔ اس طرح رمیش پھر شودر کا شودر ہی رہا۔ اسے کتوں کی طرح علیحدہ برتنوں کے گیراج میں ہی روٹی ملتی اور وہ ادھر ہی خالی بستر پر سونا پڑتا۔ وہ سارا دن پالتو کتے کی طرح گیٹ کے آگے بیٹھا رہتا۔ اس کوٹھی میں باقی بھی بہت سے نوکر تھے۔ سب ایک دوسرے سے باتیں کرتے' اکٹھے کھاتے پیتے' جب کہ اسے شودر ہونے کی وجہ سے علیحدہ ہی بٹھا کر کھانا دیا جاتا۔

ایک دن وہ باہر گیٹ کے پاس بیٹھا سوچ رہا تھا "لوگوں کی محبت حاصل کرنے کے لئے' ان میں گھل مل کر رہنے کے لئے میں نے اپنے ماں باپ کو چھوڑا' اپنا دیس چھوڑا' سوچا تھا کہ پاکستان کے مسلمان سب سے ایک جیسا سلوک کرتے ہیں۔ ان کے مذہب میں کوئی نیچ اور شودر نہیں ہے' سب برابر ہیں۔ وہ اپنے نوکروں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرتے ہیں... لیکن ادھر تو سب کچھ الٹ ہے۔ میں تو ادھر اپنے ملک سے بھی برا جانا جاتا ہوں۔ کیا یہ پاکستان نہیں؟"۔

رمیش انہی سوچوں میں گم تھا کہ اس کے پاس سے ایک لڑکا گزرا جس نے بہت بھاری بستہ اٹھایا ہوا تھا اور پسینے سے شرابور تھا۔ وہ اس کے پاس آ کر بہت ہی نرم لہجے میں بولا "بھائی' ادھر کیوں کھڑے ہو؟ آپ اسکول کیوں نہیں جاتے؟"۔

رمیش حیران ہو گیا کہ وہ تو اس لڑکے کو جانتا تک نہیں پھر بھلا اس کے دل میں اتنی ہمدردی کیوں ہے۔ مگر پھر وہ لڑکا کہنے لگا "میں آپ کو اچھی طرح جانتا ہوں لیکن آپ مجھے نہیں جانتے۔ اکثر یہاں سے گزرتے ہوئے میں نے سنا ہے کہ گھر والے آپ کو رمیش کے

نام سے پکارتے ہیں۔ میں نے اپنے گھر والوں کو بھی آپ کے بارے میں ایک مرتبہ بتایا تھا کہ رمیش نامی ہندو لڑکا اس کوچے کی صفائی ستھرائی کا کام بڑی لگن سے کرتا ہے جس کی وجہ سے وہ کوچہ جو پہلے بڑی پرانی اور بوسیدہ نظر آتی تھی' اب نئی اور صاف ستھری لگنے لگی ہے۔ آپ کے بارے میں سن کر میری امی بہت خوش ہوئی تھیں۔ بہرحال یہ بتائیے کہ آپ اداس کیوں رہتے ہیں؟"

رمیش تو پہلے ہی اس انتظار میں تھا کہ کوئی اس کی کہانی اس سے پوچھے مگر کچھ کہنا تو دور کی بات' کوئی اس بے چارے کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔ لہٰذا رمیش نے اسے سب کچھ بتا دیا۔

وہ لڑکا نفرت کرنے کے بجائے بڑی ہمدردی سے بولا "چلو بھائی میرے ساتھ میرے گھر' میری امی بہت اچھی ہیں۔ وہ تمہیں بھی اپنا بیٹا بنا لیں گی۔ میرا نام فرحان ہے اور میں ایک ایسے مدرسے میں پڑھتا ہوں جہاں بہت سے دوسرے لڑکے بھی پڑھتے ہیں۔ ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب صبح اسمبلی میں اچھی اچھی باتیں بتاتے ہیں' جنہیں سن کر بڑا مزہ آتا ہے"۔

فرحان نے رمیش کا بازو پکڑ کر کھینچا اور اسے زبردستی گھر لے جانا چاہا۔ رمیش نے ہاتھ چھڑواتے ہوئے کہا "فرحان صاحب' آپ مجھے یہاں ہی مل لیا کریں۔ مجھے گھر نہ لے کر جائیں۔ آپ کی امی آپ کو ماریں گی کہ آپ شودر کو گھر کیوں لے آئے ہو؟... اور بیگم صاحب کے ساتھ ... وعدہ!!" رمیش کچھ سوچنے لگا۔

"نہیں نہیں رمیش بھائی' میری امی ایسی نہیں ہیں۔ ایک دفعہ آپ انہیں مل کر تو دیکھیں"۔

فرحان کے اصرار پر رمیش اس کے ساتھ چلا گیا۔ فرحان کی امی نے دروازہ کھولتے ہی پوچھا "یہ آپ کے ساتھ کون ہے؟"۔

رمیش فرحان کی امی کا یہ سوال سن کر سہم گیا مگر فرحان نے جب یہ کہا کہ امی جان یہ میرا وہی دوست رمیش ہے جس کے بارے میں' میں نے آپ کو بتایا تھا تو فرحان کی امی نے کچھ اور پوچھے بغیر دونوں کو اندر آنے کے لیے کہا اور پھر ٹھنڈا پانی لا کر دیا۔ رمیش گلاس پکڑتے پکڑتے رک گیا۔ فرحان کی امی بولیں "فرحان آپ کے دوست کو کیا پیاس نہیں لگی؟ یہ پانی کیوں نہیں پی رہا؟"

"میں پلید ہوں' یہ گلاس بھی پلید ہو جائے گا" رمیش نے اپنے جسم کو گلاس سے پرے ہٹاتے ہوئے کہا۔

اتنے میں فرحان نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا گلاس رمیش کو پکڑا دیا اور رمیش کے ہاتھ والا گلاس خود لے لیا۔ فرحان نے پانی پی کر ماں کو رمیش کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ فرحان کی ماں نے یہ سب سننے کے بعد کہا "بیٹا' تم بھی فرحان کے ساتھ اسکول میں داخل ہو جاؤ اور اپنے بھائی کے ساتھ روزانہ اسکول جایا کرو"۔

"پھر اگلے دن رمیش فرحان کے دھلے ہوئے اجلے کپڑے پہن کر اسکول گیا۔ وہاں سب بچے قطاروں میں کھڑے تھے۔ سب نے ایک جیسے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ امیری غریبی' ذات پات اور اونچ نیچ کی کوئی تفریق نہ تھی۔ سب بچوں نے مل کر علامہ اقبال کی دعائیہ نظم پڑھی

ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
درد مندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا

پھر ہیڈ ماسٹر صاحب مائیک کے سامنے آئے اور بولے "عزیز دوستو! میری آج کی گفتگو کا موضوع ہے: احترامِ انسانیت۔ ہم سب آدم کی اولاد ہیں اور حضرت آدم کو اللہ تعالیٰ نے مٹی سے بنایا تھا۔ اس لئے ہم سب اپنی تخلیق کے اعتبار سے برابر ہیں۔ کسی

ہے، نہ گورے پر اور نہ کسی گورے کو کالے پر، کسی اونچے حسب نسب والے کو کسی نیچی ذات والے پر کوئی برتری یا بڑھائی حاصل نہیں۔ ہاں ہم میں سے اگر کوئی بہتر ہے تو وہ ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے۔ انسانوں کے کام آتا ہے۔ محض کسی کی ذات یا پیشے کی بنیاد پر اس سے نفرت کرنا یا اسے معتبر جاننا بہت بری بات ہے۔ کیوں کہ ہم سب کے باپ ایک ہی ہیں جو حضرت آدمؑ ہیں۔ عزیزو! محنت میں عظمت ہے۔ پاکستان کے بانی حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ نے فرمایا "کام، کام اور بس کام" یہ ہرگز نہیں کہا کہ یہ کام اور یہ کام نہیں۔ بلکہ سب کاموں کو کامیابی کی چابی قرار دیا۔ اس لیے کسی کام کو کرتے ہوئے عار محسوس نہ کیجیے اور کسی پیشے کو حقیر نہ جانیے"۔

اسمبلی ختم ہوئی تو تمام طلبہ اپنی اپنی کلاسوں میں چلے گئے۔ رمیش کا اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب نے ٹسٹ لیا جس میں اس نے درجہ پنجم تک کے تمام سوالوں کے درست جواب دیے۔ اس طرح اسے چھٹی جماعت میں داخل ہونے کی اجازت مل گئی۔ اب وہ بھی عرفان کے ساتھ اپنی جماعت میں آگیا۔ اب وہ پہلے والا رمیش نہیں رہا تھا۔ اس کے ذہن میں کش مکش پیدا ہو گئی تھی۔ "کیا وہ گیراج، وہ بیگم صاحبہ، پاکستان میں شامل نہیں۔ کیا پاکستان صرف اس اسکول اور فرحان کے گھر کا نام ہے"۔

وہ انہی سوچوں میں گم تھا کہ اسلامیات کے ٹیچر کلاس میں داخل ہوئے اور آکر اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔ کلاس کا مانیٹر تختہ سیاہ صاف کرنے لگا۔ جب وہ تختہ سیاہ صاف کر چکا تو ٹیچر چاک پکڑ کر اپنی کرسی سے اٹھنے ہی والے تھے کہ رمیش کھڑا ہو گیا "سر! میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں"۔

گویا اس کے ذہن میں موجود کش مکش اب ختم ہو گئی تھی اور وہ ایک ایسے فیصلے پر پہنچ گیا تھا جس میں اس کی دنیا اور آخرت کی کامیابی پوشیدہ تھی۔ پھر رمیش نے کلمہ طیبہ پڑھا اور مسلمان ہو گیا۔ ساری جماعت تکبیر کے نعروں سے گونج اٹھی۔ اب وہ رمیش نہیں تھا بلکہ اس کا نیا نام طلحہ تھا۔ اس کے سب ہم جماعت اس سے گلے ملے اور جس کے پاس جو چیز تھی اس نے اپنے اس نئے مسلمان بھائی کو تحفے میں دے دی۔ یوں اس کے پاس کئی قیمتی قلم، گھڑیاں اور دیگر تحائف جمع ہو گئے۔ طلحہ اور اس کے سب دوست بہت خوش نظر آرہے تھے۔ طلحہ نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اسے مسلمان ہونے پر اتنی محبتیں اور اتنا خلوص ملے گا۔ اسے اب بیگم صاحبہ کا رویہ بالکل بھول گیا تھا۔

اب طلحہ فرحان کے ساتھ باقاعدہ اسکول جاتا۔ صبح کو فرحان کے ابو سے ترجمے کے ساتھ قرآن پڑھتا۔ پانچوں وقت نماز ادا کرتا اور سکون اور اطمینان کے ساتھ رہتا۔ ایک دن فرحان کے ابو نے پوچھا "طلحہ بیٹا! یہ تم فجر کی نماز کے بعد قرآن کا مطالعہ کر کے اسکول کے لیے تیاری سے پہلے کہاں جاتے ہو؟"

"بیگم صاحبہ کے پاس" طلحہ نے معصومیت سے کہا۔

"کون سی بیگم صاحبہ کے پاس اور کس لیے؟" طلحہ کے ابو نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"وہ بیگم صاحبہ جنھوں نے مجھے پاکستان آنے پر رہائش دی تھی، کھانے کو دیا تھا اور اپنے گھر میں ہی کام پر بھی لگایا تھا"۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر اب تمھیں نہ رہائش کا مسئلہ ہے نہ کھانے کا، پھر کیوں ان کے پاس جاتے ہو؟"

"غسل خانوں اور بیت الخلا کی صفائی کے لیے معصومہ نے کسی

قسم کی جھجک محسوس کئے بغیر کہا۔

"مگر وہ کیوں؟"

"بیگم صاحب نے مجھ سے یہ وعدہ لے کر کام پر لگایا تھا کہ میں کام چھوڑ کر بھاگوں گا نہیں ' اس وقت تو میں ان کے پاس سے اس لئے بھاگ آیا تھا کہ ہم ہندوؤں میں وعدہ خلافی کو کوئی خاص جرم نہیں سمجھا جاتا مگر جب سے میں مسلمان ہوا ہوں مجھے علم ہو گیا ہے کہ جو بد عہد ہو اس کا کوئی ایمان نہیں ہوتا۔ پہلے بیگم صاحب سے یہ وعدہ رمیش کا تھا اس لئے مجھے پروا نہ تھی مگر اب یہ وعدہ طلحہ کا بن گیا ہے اس لئے جب تک میری زندگی ہے میں اسے نبھاتا رہوں گا۔"

طلحہ کی یہ بات سن کر فرحان کے ابو مسکرا دیے۔ وقت گزرتا رہا۔ طلحہ پڑھ لکھ کر عالم فاضل بن گیا مگر وہ اب بھی اپنا وعدہ باقاعدگی سے نبھاتا۔ اس ایفائے عہد کا یہ فائدہ ہوا کہ بیگم صاحب اور ان کے گھر والے جو پہلے نام کے مسلمان تھے مگر کردار کے ہندو ہی تھے' وہ بھی سچے اور پکے مسلمان بن گئے۔ بیگم صاحب کے دل پر تو طلحہ کے کردار کا اس قدر اچھا اثر ہوا کہ انھوں نے اپنی بیٹی آمنہ کی شادی اس کے ساتھ کر دی۔

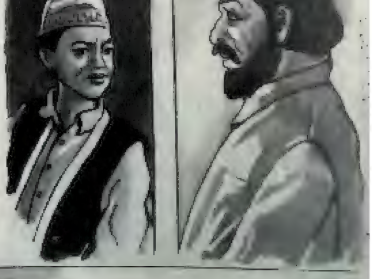

اب طلحہ شہر کے ایک دینی مدرسے میں بچوں کو اسلام کی تعلیم دیتا ہے اور اس کا شمار شہر کے معزز لوگوں میں ہوتا ہے مگر اس کے باوجود بیگم صاحب سے کیا ہوا وعدہ روزانہ صبح

نبھاتا ہے۔ جب آمنہ اپنے میکے آئی ہو تو وہ بھی اس کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ بیگم صاحب تو کئی سال ہوئے اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ اب بھی ان کے گھر والے طلحہ صاحب کی بہت عزت کرتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ آپ کا ہمارے گھر میں قدم رکھنا ہی بڑی سعادت اور برکت کا باعث ہے۔ آپ ہمارے بڑے محترم مہمان ہیں۔ للذا صفائی نہ کیا کریں۔ مگر وہ کسی بھی کام کو عار نہیں سمجھتا بلکہ طلحہ بیگم صاحب کا داماد ہونے کے باوجود کام کو عبادت جانتے ہوئے اس وعدے کو نبھا رہا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اسے دنیا میں عزت محض اس لیے ملی ہے کہ وہ کسی کام کو برا نہیں سمجھتا اور کسی بھی قسم کا کام کرتے ہوئے جھجک یا عار محسوس نہیں کرتا اور حلال کی روزی کمانے والے ہر پیشے کو محترم سمجھتا ہے۔

ایک روز وہ حسب معمول صفائی کرنے میں مصروف تھا کہ اچانک پاؤں پھسلنے سے گر پڑا۔ جس سے اسے شدید چوٹیں آگئیں۔ گھر والے اسے اسی وقت ہسپتال لے گئے۔ عزیز 'دوست' رشتہ دار بلکہ محلے کے سب لوگ اس کی عیادت کے لیے آئے۔ کوئی پھول اٹھائے آرہا ہے تو کوئی پھولوں کا گلدستہ لیے۔ سب لوگوں کی زبان سے اس طرح طلحہ کی صحت یابی کے لیے دعائیں نکل رہی تھیں جیسے وہ ان کا قریبی رشتے دار ہو۔ تکلیف کے ان لمحوں میں عیادت اور تیمارداری کے اس اعلیٰ نمونے سے اسے اپنے ماں باپ کی محبت یاد آگئی۔ وہ بچپن کی یادوں میں کھو گیا۔ وہ سات سال کا تھا جب اس کے گھٹنے پر چوٹ لگی تھی۔ اس وقت ایسی سچی محبت اور دلی خلوص اسے سوائے اپنے ماں باپ کے اور کسی سے نہیں ملا تھا۔ پھر جب وہ صحت یاب ہو کر گھر واپس لوٹا تو سب سے پہلے اس نے اپنے ابو کو خط لکھا۔

اس خط میں اس نے پاکستان پہنچنے سے لے کر اب تک کے سب حالات بڑی تفصیل سے لکھے۔ نیز اس نے لکھا "پیارے ابا جان! یہ خط صرف آپ کے لیے ہی نہیں پوری ہندو قوم کے لیے ہے۔ ذات پات اور چھوت چھات میں بٹ کر ہندو قوم نے اپنے معاشرے کو جیتے جی دوزخ بنا لیا ہے۔ میرا یہ ہندو قوم کے لیے پیغام ہے کہ پرسکون معاشرے اور خوشگوار ماحول کو دیکھنا چاہتے ہو تو انسانیت کو کم تر سمجھنے کے بجائے اس سے محبت اور پیار کرو۔

حل بھیجئے اور 450 روپے کی کتابیں لیجئے۔

ایک سے زائد اور سات سے کم حل موصول ہونے کی صورت میں انعام مساوی مالیت میں دیئے جائیں گے۔ سات یا سات سے زیادہ حل موصول ہونے کی صورت میں فیصلہ بذریعہ قرعہ اندازی ہوگا اور چھ انعام بالترتیب 100, 90, 80, 70, 60 اور 50 روپے کی مالیت کی کتابوں کے دیئے جائیں گے۔

یہ جملے اسی شمارے میں چھپی ہوئی عبارت سے لیے گئے ہیں۔

1- انہیں اس نے قتل کیا کہ وہ بچے ------ تھے۔

2- ------ ہمیشہ سچ اور حق کی بنیاد پر بات کرتے ہیں۔

3- ذات کی زندگی میں اکٹھے رہنے سے مجھے ------ برداشت ہے۔

4- بہار کی کس ------ کا نام ہے؟

5- یہ وہ جانور ہیں جنہیں بڑی کھال ------ کی سب سے بڑی نعمت ملتی ہے۔

6- مسلمانوں کی دینی زبان تو ------ تھی۔

7- غازی علم دین شہید کا مزار لاہور کے قبرستان ------ میں ہے۔

8- جو شخص ------ ہو وہ کوئی نہ کوئی غلطی کر بیٹھتا ہے۔

9- بھلا سردی اور ------ سے نیند کیسے آتی۔

10- آج ان بے چاروں کے ------ ان سے بچھڑے ہیں تو کل ہماری باری بھی آسکتی ہے۔

جوابات علمی آزمائش جولائی 1999ء

(1) قیامت (2) بھنو (3) چوری (4) اثر (5) کتا (6) جانوروں (7) وطن (8) شہر (9) ٹیک لگائی (10) وزیر۔

اس دفعہ 2094 ساتھیوں کے بالکل درست حل موصول ہوئے۔

ان میں سے چھ ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعام دیئے جارہے ہیں۔

پہلا انعام: آکاش احمد عامر، چھالیہ۔

دوسرا انعام: محمد مالک، چیچہ وطنی۔

تیسرا انعام: حافظ محمد اشرف، حافظ آباد۔

چوتھا انعام: احمد نعمان، سرگودھا۔

پانچواں انعام: توقیر احمد ناصر، رکھی۔

چھٹا انعام: محمد حیدر خان، لاہور۔

ان ساتھیوں کے نام بذریعہ قرعہ اندازی شائع کئے جارہے ہیں۔

نورین رفیق گجرات۔ محمد ارباب الحق حیدر آباد۔ کشور پروین سکھر۔ سعدیہ وحید سرگودھا۔ محمد سلمان خان فیصل آباد۔ فائزہ رشید کراچی۔ رضوانہ امتیاز فیصل آباد۔ وقار احمد صدیقی میاں کوٹ۔ سلیم طارق گوجرانوالہ۔ محمد عمر رحیم یار خان۔ سلما حسین پشاور۔ محمد ارقم اکرم اوکاڑا۔ حافظ احمد سعید گوجرانوالہ۔ حسان بیگ لاہور۔ ثنا اشرف گوجرانوالہ۔ محمد شارق بشیر روہڑی۔ عظمیٰ یوسف لاہور۔ محمد اکرم راولپنڈی۔ سیدہ حنا نورین کاظمی کراچی۔ کنول منور جھنگ۔ عدیلہ سحر رحیم یار خان۔ اقصیٰ اصغر فیصل آباد۔ کنزہ فاطمہ اسلام آباد۔ محمد منصور امین جرال میرپور۔ سحرش خالد جہلم۔ عمارہ ظفر راولپنڈی۔ ثروت نور شرق پور۔ ہارون محمود لاہور۔ محمد محسن کرمانی اسلام آباد۔ عبدالاحد صادق آباد۔ وقاص بشیر میرپور۔ کیوان رشید چودھری ساہی وال۔ محمد مظہر حسین چکوال۔ چودھری محمد صدیق منگلا ڈیم۔ عرشی قمر لاہور۔ سید اظہر علی شجاع آباد۔ احمد حسان لاہور۔ لبنیٰ حسین کراچی۔ مسرت حلیمی حویلیاں چھاؤنی۔ افسانہ حنیف میرپور۔ فائزہ انجم سرگودھا۔ غزالہ طارق راولپنڈی۔ ارسلان خالد ساہی وال۔ صائمہ شاہد لاہور۔ سجاد احمد گوجرانوالہ۔ محبوب ایوب ملتان۔ آمنہ طارق لاہور۔ شافیہ اسلم بیگ گجرات۔ مطاہرہ شیر جنگ گجرات۔ سلمان نعیم رحیم یار خان۔ محمد یاسر سلیم راولپنڈی۔ جویریہ حسین لاہور۔ عدیل اشتیاق لاہور۔ سمیعہ حق کراچی۔ حبیب نذر چکوال۔ عاصمہ آفتاب سرگودھا۔ جواد حسن مرزا سرگودھا۔ سید عاطف رضا راولپنڈی۔ فیصل اعوان اٹک۔ فائقہ انجم اٹک۔

[illegible]

نام ____________________

مقام ____________________

پتا ____________________

____

"شب خون کے علاوہ بھی آپ نے کسی معرکے میں حصہ لیا؟" میں نے نور خاں سے پوچھا۔

"جی ہاں' کرگل کے محاذ کی بات ہے کہ ہمیں پتا چلا کہ کرگل کے قریب دریائے شگو کے کنارے پہاڑ کی چوٹی پر بھارتی مورچہ ہے۔ اس مورچے پر برف جمی ہوئی تھی کیوں کہ مورچہ 17 ہزار فٹ کی بلندی پر ہے۔ بھارتی فوجی یہاں صبح سویرے آتے اور رات کو چلے جاتے۔ ان کی تعداد 10 تھی۔ وہ اپنا خیمہ اور دوپہر کے کھانے کا سامان ساتھ لاتے تھے۔ طے ہوا کہ اس چوکی پر قبضہ کیا جائے۔ لیکن کیسے؟ کیوں کہ چوٹی پر چڑھ کر حملہ کرنا ناممکن تھا۔ چوٹی پر جانے کا ایک ہی ٹیڑھا میڑھا راستہ تھا جو بھارتی فوج کی دور بینوں کی زد میں تھا اور جس کا رخ کرگل چھاؤنی کی طرف تھا۔ یہ چوکی جس جگہ پر تھی وہاں سے ہمارے سارے راستے نظر آتے تھے۔ اس لیے اسے تباہ کرنا بھی ضروری تھا۔

آخر ایک چاندنی رات 10 مجاہد رسوں کی مدد سے دریائے شگو کی طرف سے آدھی رات کو پہاڑ کی چوٹی پر چڑھے۔ اس وقت برف باری شروع ہو گئی تھی۔ ہمارے امیر نے کہا کہ ہتھیار اوڑھ کر لو اور برف کے اندر چھپ کر سو جاؤ۔ صبح جب بھارتی فوجی ڈیوٹی کے لیے آئیں گے تو میں فائر کروں گا اور اس کے ساتھ ہی آپ سب بھارتی فوجیوں پر پل پڑیں۔ رات برف باری ہوتی رہی اور ہم برف اوپر لے کر لیٹے رہے۔ بھلا سردی اور شوق جہاد سے نیند کیسے آتی۔ صبح برف باری بند ہوئی' دن چڑھا اور بھارتی فوجی خیمے اور دوپہر کے کھانے کا سامان لے کر ایک ہاورچی کے ہمراہ اوپر آگئے۔

اوپر آکر وہ ابھی خیمہ زن بھی نہ ہوئے تھے کہ امیر عبدالکریم کے اشارے پر ہم برف کے لحاف اتار کر باہر آئے اور ان کے سنبھلنے سے پہلے خنجروں کے واروں سے انہیں جہنم رسید کر دیا۔ یہ چوکی اب خالی ہے۔ ہم اس کی مدد سے کرگل کی چھاؤنی میں ہر آنے جانے والے فوجی قافلے پر نگاہ رکھ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت بری طرح چلا رہا ہے۔ دراس اور کرگل کی کام یابیوں سے بھارت کی تمام جنگی تیاریاں اور تمام جنگی تخصیصات ہمارے سامنے کھل کر آگئی ہیں اور بھارت اب خود کو غیر محفوظ سمجھتا ہے"۔

نور خاں کی عمر 25 سال تھی اور وہ ملتستان کے صدر مقام سکردو میں ایک چائے خانہ میں بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ وہ کرگل کے محاذ سے دو دن پہلے اپنے ساتھی مجاہدوں

کے لیے دوائیاں لینے آیا تھا۔ میں راول پنڈی سے سکردو گیا تھا تاکہ سری نگر سے لہ جانے والی سڑک کے ساتھ ساتھ جو لڑائی شروع ہوئی تھی اس کی تازہ خبریں اپنے اخبار "شب و روز" کو ارسال کروں اور اب میں اسی سلسلے میں نور خاں سے گفت گو کر رہا تھا۔

"ریاست جموں کشمیر کے انگریزوں کے وقت میں 6 حصے تھے: علاقہ جموں' مقبوضہ کشمیر' آزاد کشمیر' لداخ' بلتستان اور گلگت۔ 48-1947ء میں آزاد کشمیر بلتستان اور گلگت نے ڈوگرہ مہاراجا ہری سنگھ اور بھارتی فوج کا مقابلہ کیا۔ ڈوگرہ لشکریوں اور بھارتی فوجیوں کو شکست دی۔ کشمیر کا کچھ علاقہ آزاد کروایا جو آزاد کشمیر کہلایا۔ بلتستان اور گلگت کے لوگ بھی اس کے ساتھ ہی آزاد ہو گئے۔ اس لڑائی کے دوران میں بھی دراس اور کرگل پر مجاہدوں نے قبضہ کر لیا تھا"۔

میرے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے نور خاں نے بتایا۔

"لداخ کا مرکزی شہر لہ ہے' جہاں سے کسی زمانے میں چین اور روس کو تجارتی قافلے جاتے تھے۔ اب یہ تجارتی راستہ بند ہے لیکن سری نگر سے لہ تک سڑک جاتی ہے جس کے ذریعے بھارتی حکومت فوجی ٹرک' ٹینک' توپیں' کھانے پینے کی چیزیں اور دوسرا گولہ بارود لہ' نوبرا وادی' سیاچین گلیشر' بٹالک' کرگل' دراس اور بانڈی پورہ بھیجتی ہے"۔

"محاذ تو کئی ہیں جن پر مجاہدین بھارتی فوجیوں کو تہس نہس کر رہے ہیں لیکن دراس اور کرگل کے محاذوں پر لڑنا ذرا زیادہ مشکل ہو رہا ہے' اس کی کیا وجہ؟"

"بلتستان پاکستان کے شمال میں ہے۔ یہ علاقہ آزاد کشمیر کے شمال مغرب میں ہے۔ سکردو صدر مقام ہے۔ دراس اور کرگل کے درمیان 39 میل کا فاصلہ ہے۔ بلتستان اور لداخ کا علاقہ تین قسم کا ہے۔ ایک قسم تو وہ ہے جس میں گہرائیاں ہیں۔ دوسری قسم کی زمین 6 ہزار فٹ سے 10 ہزار فٹ کی بلندی پر ہے اور دریائے سندھ کے معاون دریاؤں کی بدولت سرسبز وادیوں میں شمار ہوتی ہے۔ تیسری قسم وہ علاقہ ہے جو 16 ہزار فٹ سے 28 ہزار فٹ کی بلندی تک جاتا ہے۔ 16 ہزار فٹ سے بلند تمام پہاڑی چوٹیاں برف پوش ہیں اور 11 ہزار فٹ کی بلندی سے اوپر نہ فصلیں اگتی ہیں اور نہ ہی درخت۔ دنیا میں سب سے زیادہ اونچے پہاڑ اس علاقے میں ہیں۔ اس لیے اس علاقے میں آمد و رفت کی دشواری کی وجہ سے لڑنا اور لڑائی کو جیتنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے"۔

"میں نے کہیں پڑھا ہے کہ دراس اور کرگل کی لڑائی 12 ہزار فٹ سے لے کر 17 ہزار فٹ بلند پہاڑوں پر ہو رہی ہے" میں نے کہا۔

"آپ نے درست پڑھا ہے۔ دراس کی وادی سطح سمندر سے 10 ہزار فٹ بلند ہے۔ سکردو کی وادی ساڑھے سات ہزار فٹ بلند ہے۔ جس طرح سکردو کی وادی میں کئی چھوٹے چھوٹے گاؤں ہیں اسی طرح کے دراس کی وادی میں بھی کئی گاؤں ہیں۔ کرگل کے سارے علاقے میں مسلمانوں کی اکثریت ہے"۔

"کرگل کی سطح سمندر سے بلندی کتنی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کرگل 8790 فٹ کی بلندی پر ہے۔ یہ شہر سری نگر سے 204 کلو میٹر دور ہے۔ یہاں سے لداخ کا صدر مقام لہ 230 کلو میٹر ہے۔ سری نگر' دراس' کرگل اور لہ ایک بڑی سڑک پر ہیں۔ بھارت سرکار اسے قومی شاہراہ یعنی نیشنل ہائی وے کا نام دیتی ہے۔ سکردو سے جو سڑک آتی ہے وہ دراس کے قریب اس بڑی سڑک سے آکر ملتی ہے۔ دراس سے سکردو کا فاصلہ 133 کلو میٹر ہے۔

48-1947ء میں مجاہدین نے سونا مرگ۔ بانڈی پورہ۔ درہ زوجی لا' دراس اور کرگل پر قبضہ کر لیا تھا لیکن بھارتی جہازوں نے مجاہدوں کو بم باری کر کے اور کرگل میں فوجی اتار کر پسپا کر دیا۔

"اس وقت لڑائی کی کیا کیفیت ہے؟" میں نے نور خان سے سوال کیا۔

"لڑائی جاری ہے۔ 50 سال ہو گئے ہیں کشمیریوں کو بھارت کے ٹینکوں توپوں اور جہازوں سے لڑتے ہوئے۔ جب تک بھارت کے ظالم حکم ران جموں کشمیر میں موجود ہیں لڑائی جاری رہے گی۔ اس وقت کرگل کے محاذ پر 500 مجاہد سری نگر سے کرگل جانے والی شاہراہ کے ساتھ ساتھ بلند و بالا چوٹیوں پر جوش اور جذبے سے لڑ رہے ہیں۔ کرگل میں ہوائی اڈہ ہے اور وہاں روزانہ انڈین جہاز سپاہی اور سازو سامان لے کر اترتے ہیں۔ اس اڈے سے بم بار جہاز بھی اڑتے ہیں اور چوٹیوں پر لڑنے والے مجاہدوں کو نشانہ بناتے ہیں۔ اس وقت کرگل کا زمینی راستہ بند اور ہوائی راستہ کھلا ہے"۔

"کرگل فوجی اعتبار سے کیوں اہم ہے؟" میں نے پوچھا۔

نور خان نے قہوہ کا آرڈر دیا اور بولا "کرگل کی حیثیت مرکزی ہے۔ آپ کرگل سے لہ جا سکتے ہیں یا رگی جا سکتے ہیں اسکردو جا سکتے ہیں اور سری نگر جا سکتے ہیں۔ بھارت کی یہ بہت بڑی فوجی چھاؤنی بن گیا ہے۔ یہاں سے بھارت اپنی فوجی طاقت جس طرف چاہے پھیلا سکتا ہے۔ کرگل کی اہمیت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ کرگل سے دشمن سازو سامان اور گولہ بارود لہ بھیجتا ہے۔ کرگل پر قبضہ ہو جائے تو دشمن لہ کی طرف نہ فوجی بھیج سکتا ہے اور نہ ہی گولی سکہ۔ اس کی پہنچ صرف جہازوں کے ذریعے لہ تک ہو سکتی ہے اور جہازوں کو بھی گولہ باری سے گرایا جا سکتا ہے۔ کیوں سے دو بھارتی جہاز اور کئی ہیلی کاپٹر بھی مار گرائے ہیں۔ اگر کرگل محاذ اور باٹالک پورہ محاذ پر مجاہدوں کو کامیابی حاصل ہو جائے تو پھر سری نگر کو فتح کرنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ کرگل کی طرف سے اور باٹالک پورہ کی طرف سے مجاہدوں کے لشکر موجِنا موومنٹ کے ذریعے، دشمن کو ادھر پہنچا سکتے ہیں۔ موجِنا موومنٹ فوج کی اس کارروائی کو کہتے ہیں جس کے ذریعے دو فوجی دستے مخالف فوج کو دو مختلف طرفوں سے حملہ کر کے ختم کر دیتے ہیں۔ جس طرح موچنا دو طرف سے بال کو پکڑ کر اکھاڑ دیتا ہے اسی طرح دو طرف دو فوجی دستے مخالف فوج کو شکست دیتے ہیں"۔

قہوہ آ گیا تھا۔ نور خان نے قہوہ کا گھونٹ بھرا اور بولا "آپ اخبار نویس ہیں۔ اس لڑائی اور اس خطے کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔ میں نے تو اپنے ہوش اور جذبے سے کام لے کر آپ کو وہ باتیں بتائی ہیں جو شاید آپ کے لیے غیر اہم ہوں"

"آپ یہ بتایئے کہ مجاہد کیسے لڑتے ہیں"

"ہم رات کو سا کن ہدف پر شب خون مارتے ہیں

اور حرکت کرتی ہوئی فوج پر بم گرا کر گولی چلاتے ہیں یعنی گھات لگا کر حملہ کرتے ہیں۔ یہ دونوں طریقے گوریلا لڑائی کے لیے استعمال ہوتے ہیں اور کشمیر میں ان کو کام یابی سے آزمایا جا رہا ہے۔

"ایسا کوئی واقعہ جس سے آپ کی اس بات کی وضاحت ہو سکے؟" میں نے کہا۔

بھارت سری نگر سے لہ جانے والی سڑک پر درہ زوجی لا کے قریب ایک گاؤں' ہنڈراس میں بوفورس توپ نصب کیے ہوئے تھا اور مجاہدوں پر اندھا دھند گولہ باری ہو رہی تھی۔ مجھے حکم ملا کہ بوفورس توپ کے اس ٹھکانے کو تباہ کرنا ہے۔ چناں چہ میں نے 5 ساتھی لیے اور ہم دن کو ہی چھپتے چھپاتے ہنڈراس کی طرف چل پڑے۔ سفر پہاڑی تھا اس لیے بہت مشکل تھا۔ ہمیں اس معرکے کے لیے دو دن اور دو راتیں دی گئی تھیں۔ ہم چٹانوں کی اوٹ میں ندی نالوں کی گزرگاہوں کے ساتھ چھپتے چھپاتے چلتے رہے۔ دن کو سفر کرنا جان جوکھوں میں ڈالنا تھا۔ رات کو سفر کرتے ہوئے راستہ بھول جانا عین ممکن تھا۔ بہرحال کمپاس (قطب نما) کی مدد سے دو دن اور ایک رات سفر کرتے ہوئے ہم ہنڈراس پہنچ گئے اور ایک غار میں چھپ گئے جو غالباً کسی ریچھ کا گھر تھا۔

یہ ہماری آخری رات تھی۔ ہمیں کام یاب ہونا تھا۔ چناں چہ ہم رات 11 بجے غار سے نکلے۔ اللہ کا نام لیا۔ دو دو دستی بم لیے اور تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پتھروں کے اس احاطہ میں پہنچے جہاں توپ بوفورس نصب تھی اور کنستروں میں توپ کے گولے پڑے تھے۔ تین توپ چلانے والے فوجی کرسیوں پر بیٹھے تھے اور ایک توپ کے پاس کھڑا تھا۔ میں نے پتھر کی دیوار کی اوٹ میں کھڑے ہو کر جائزہ لیا اور پھر اشارہ کیا۔ دستی بم گرے اور پھٹے اور چاروں فوجیوں کے پرخچے اڑ گئے۔ طے شدہ پروگرام کے تحت ہم نے پہاڑی کا رخ کیا لیکن بھاگنے سے پہلے باقی دستی بم بھی احاطہ میں پھینک دیے۔

ہم نے اپنا سفر جاری رکھا۔ نالے کا رخ ہمارے کیمپ کی طرف تھا لیکن وہ بہت گہرا ہو رہا تھا۔ اس لیے ہمیں وہی راستہ اختیار کرنا پڑا جس راستے سے آئے تھے۔ سارا دن سفر کرنے کے بعد ہم رات کو اپنے کیمپ میں پہنچ گئے۔ اس کے بعد ہنڈراس کے گاؤں سے ہم پر توپ نے آج تک گولے نہیں برسائے۔ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ ہمارا شب خون کام یاب رہا"۔

"لگتا ہے لڑائی دراس کرگل روڈ پر ہو رہی ہے اور کہیں نہیں" میں نے کہا۔

"کشمیر کی آزادی کی لڑائی سارے جموں و کشمیر میں ہو رہی ہے۔ ڈوڈہ میں لڑائی ہو رہی ہے جو صوبہ جموں میں ہے۔ سری نگر کے ارد گرد بھی لڑائی کی اطلاعات آتی رہتی ہیں جو صوبہ کشمیر کا مرکزی شہر ہے۔ دراس اور کرگل میں بھی مجاہد لڑ رہے ہیں۔ ہاں آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس محاذ پر لڑائی شدید ہے"

"مجاہد تعداد میں کم ہیں۔ ان کے پاس سازو سامان بھی کم ہے۔ پہاڑوں اور برف پر لڑنے کے لیے خاص قسم کا لباس اور بوٹ درکار ہوتے ہیں' وہ لباس اور بوٹ ان کے پاس نہیں' گولی سکہ بھی زیادہ نہیں۔ توپیں ٹینک اور جہاز بھی نہیں ہیں۔ اس کے باوجود وہ کام یاب ہو رہے ہیں۔ آپ کے خیال میں اس کی وجہ کیا ہے؟" میں نے نور خاں سے پوچھا۔

"جہاد کا جذبہ اور اللہ کی راہ میں لڑتے ہوئے جان اللہ کے سپرد کرنے کا عقیدہ' اس کے برعکس بھارتی فوجی محض تنخواہ کے لیے لڑتے ہیں اور جب دیکھتے ہیں کہ بچنا محال ہے تو بھاگ جاتے ہیں"۔

نور خاں نے سینہ تانتے ہوئے کہا اور مجھ سے مصافحہ کر کے محاذ جنگ کی طرف چل دیا۔ اس کی دوائیاں جیپ میں تھیں جسے وہ خود چلا رہا تھا۔ میرے دل سے دعا نکلی "اللہ اسے اور اس کے بہادر ساتھیوں کو کام یابی عطا فرما اور ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دے"۔

کھیلوں کی دنیا

ڈینجرس مین اور اسپیڈ ماسٹر

عین الطاف

کرکٹ ایک ایسا کھیل ہے جس میں کھلاڑی یا تو صرف ایک میچ کھیل کر شہرت کی بلندی کو چھونے لگتے ہیں یا وہ کئی سال تک نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ بارجیت کھیل کا حصہ ہوتی ہے مگر یہ عجیب بات ہے کہ کوئی بھی ملک بار برداشت کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ ورلڈ کپ 1999ء میں پاکستان کے آسٹریلیا سے فائنل میچ ہارنے پر پوری قوم ابھی تک سوگ منا رہی ہے اور قومی کرکٹ ٹیم پر طرح طرح کے تبصرے کئے جارہے ہیں۔ حال آں کہ میدان میں اترنے والی دو ٹیموں میں سے ایک کی ہار لازمی ہوتی ہے۔ ہمارے کھلاڑی الحمدللہ عالمی ریکارڈز کے حامل ہیں۔ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ انہوں نے حال ہی میں (16 اپریل 1999ء کو) شارجہ کپ' ایشین ٹسٹ چیمپئن شپ اور پاک بھارت ٹسٹ سیریز میں شان دار کام یابی حاصل کی ہے اور پھر ہماری ٹیم کا ورلڈ کپ کے فائنل میں جانا بھی بہت بڑا اعزاز ہے۔ ہمارے خیال میں فائنل میں پہنچ کر ہار جانے پر اپنے قومی ہیروز کو زیرو قرار دے دینا کسی طور پر مناسب نہیں۔ کسی قسم کا تبصرہ کرنے سے پہلے ہمیں ان کی لازوال کام یابیوں اور شان دار کارناموں کو ضرور مدنظر رکھنا چاہیے۔ یہاں ہم اپنی خوبیوں کے حامل دو ایسے قومی ہیروز کا ذکر کر رہے ہیں جنھوں نے اپنا نام دنیائے کرکٹ میں سنہری حروف میں لکھوایا۔ ورلڈ کپ فائنل میں ہار سے ان کی شہرت ماند نہیں پڑی بلکہ ان کا نام اب بھی ہر ملک میں پاکستان کے وقار اور افتخار کے طور پر لیا جاتا ہے۔

ڈینجرس مین: 14 اکتوبر 1996ء کا دن ایک یادگار دن تھا۔ جب دنیائے کرکٹ کی تیز ترین سنچری بنانے والا کھلاڑی کم دوسرے کھلاڑی کے ان فٹ ہونے پر ٹیم میں لیگ سپنر کی حیثیت سے شامل ہوا اور اس نے اوپن اننگ کرتے ہوئے صرف 37 گیندیں کھیل کر تیز ترین سنچری بنانے کا ریکارڈ قائم کیا۔ اس وقت اس نوعمر کھلاڑی کی عمر صرف 16 سال اور 217 دن تھی۔ اس طرح وہ سنچری بنانے والا کم عمر ترین کھلاڑی بھی ہے۔

جی ہاں یہ عالمی شہرت یافتہ کھلاڑی شاہد آفریدی ہیں جو یکم مارچ 1980ء کو خیبر ایجنسی میں پیدا ہوئے اور دائیں ہاتھ سے لیگ اسپن اوپن اننگ یا مڈل آرڈر بیٹسمین اور لیگ بریک باؤلر کے طور سے جانے جاتے ہیں۔

شاہد خان آفریدی نے 1996ء میں کینیا کے خلاف اپنے ون ڈے انٹرنیشنل کا آغاز کیا اور پھر اپنے دوسرے ہی میچ میں تیز ترین سنچری بنانے کا اعزاز حاصل کیا۔ وہ اب تک 93 ون ڈے میں 1953 سے زائد رنز بنا چکے ہیں۔ ان کا بہترین اسکور 109 رنز ہے۔ انہوں نے اب تک 2 سنچریاں اور 10 نصف سنچریاں اسکور کی ہیں۔ وہ ایک کام یاب لیگ سپنر باؤلر بھی ہیں اور اب تک ون ڈے میں 54 سے زائد وکٹیں بھی لے چکے ہیں۔ ان کی بہترین باؤلنگ 3/33 ہے۔

شاہد خان آفریدی 14 اکتوبر 1996ء کو سب سے زیادہ 11 ایک ان اننگ میں (11) چھکوں کا عالمی ریکارڈ بھی قائم کر چکے ہیں۔ تماشائی اسٹیڈیم میں شاہد آفریدی کی صرف دھواں دھار بیٹنگ دیکھنے ہی تو آتے ہیں۔ کیوں کہ وہ اوپن اننگ کرتے ہوئے جارحانہ انداز میں

کھیلتے ہیں۔ کبھی تو تماشائی انہیں ڈینجرس مین کے نام سے پکارتے ہیں۔ وہ بعض اوقات جلد بازی میں غلط شاٹ کھیلتے ہوئے آؤٹ ہو جاتے ہیں لیکن ان کے پرستاروں میں دن بدن اضافے کی وجہ ان کا یہی جارحانہ انداز ہے۔

شاہد آفریدی نے اپنے ٹسٹ کیریئر کا آغاز 99-1998 میں کیا۔ پہلے میچ میں بحیثیت باؤلر 5 وکٹیں حاصل کیں اور بیٹنگ میں وہ ناکام رہے مگر دوسرے ہی ٹسٹ میں بھارت کے خلاف مدراس ٹسٹ میں اپنی پہلی ٹسٹ سنچری بنائی۔ شاہد خان آفریدی نے 21 چوکوں اور 3 چھکوں کی مدد سے 141 رنز بنا کر یہ بتا دیا کہ وہ صرف ون ڈے ہی کے کھلاڑی نہیں بلکہ ٹسٹ کرکٹ کے بھی کامیاب کھلاڑی ہیں۔

شاہد خان آفریدی ایک باصلاحیت کھلاڑی ہیں اور تماشائی انہیں کھیلتے ہوئے دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ لیکن ان کو شاید کریز سے زیادہ پویلین پسند ہے۔ اسی لیے تو وہ کئی دفعہ غیر ضروری شارٹس کھیل کر جلد آؤٹ ہو جاتے ہیں۔ جس سے بعض اوقات ٹیم کو بہت نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔

ورلڈ کپ 1999ء میں بھی وہ اپنے جارحانہ انداز کی وجہ سے کوئی اچھی کارکردگی کا مظاہرہ نہ کر سکے۔ انہوں نے آتے ہی چوکے چھکے ضرور لگائے لیکن اگر تحمل مزاجی سے کھیلتے تو بہت بہتر نتائج سامنے آتے۔ مگر انہوں نے یہ شاید اس لیے نہ کیا کہ اس سے ان کے ڈینجرس مین کے خطاب پر حرف آتا تھا۔

اسپیڈ ماسٹر: 5 فٹ 11 انچ کے قامت اور مضبوط جسامت کا مالک یہ نوجوان کھلاڑی پاکستان کی فاسٹ باؤلنگ میں ایک بہترین اضافہ ہے۔ ان کو دنیائے کرکٹ میں راول پنڈی ایکسپریس کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جی ہاں یہ شعیب اختر ہی ہیں جن کو موجودہ کرکٹ کا تیز ترین باؤلر تسلیم کیا گیا ہے۔ آسٹریلین کرکٹ بورڈ کی ایک رپورٹ کے مطابق وہ 148.4 کلومیٹر فی گھنٹا کی رفتار سے باؤلنگ کر چکے ہیں جو سابق تیز ترین باؤلر جیف تھامسن کے بعد دوسری پوزیشن بنتی ہے۔ اسی لیے تو انہیں اسپیڈ ماسٹر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ آسٹریلیا کے جیف تھامسن نے 1970ء کی دہائی میں 160.4 کلومیٹر فی گھنٹا کی رفتار سے باؤلنگ کر کے عالمی ریکارڈ قائم کیا تھا۔ ورلڈ کپ 1999ء کے دوران میں اسپیڈ ماسٹر شعیب اختر نے 95 میل فی گھنٹا کی رفتار سے باؤلنگ کی۔ اس سے پہلے وہ شارجہ کپ میں 97 میل فی گھنٹا رفتار سے باؤلنگ کروا چکے ہیں۔ شعیب اختر کی طوفانی باؤلنگ نے بلے بازوں کو پریشانی میں مبتلا کر دیا ہے۔ ان کے سوئنگ انگ یارکر بیٹسمین کے لیے انتہائی پریشانی کا باعث ہوتے ہیں۔ شعیب اختر 35 قدم کے رن اپ سے باؤلنگ کرواتے ہیں۔ ان کی باؤلنگ کے دنیا بھر کے اخبارات میں چرچے ہیں۔ بڑے سے بڑا بیٹسمین شعیب اختر کا سامنا کرنے سے گھبراتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ انہوں نے کرکٹ میں اپنی دھاک بٹھا دی ہے۔ ان کا سامنا کرنے والے بلے بازوں کو صرف ہلکی سی آواز سے پتا چلتا کہ کوئی چیز قریب سے گزری ہے۔ لیکن حقیقت کا احساس تو اس وقت ہوتا ہے جب پیر یا پسلی پر گیند لگ چکی ہوتی ہے یا وکٹیں بکھر چکی ہوتی ہیں۔ شعیب اختر اگر بولڈ کریں تو بعض اوقات وکٹ کے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ گیند شعیب کے ہاتھ سے نکلنے کے بعد اس قدر تیزی سے آتی ہے کہ ایک سیکنڈ کے تیسرے حصے میں بیٹسمین کو شاٹ کھیل جانا ہوتا ہے یعنی پلک جھپکنے میں اسٹروک کھیل سکے تو ٹھیک ورنہ اس کا انجام برا ہوتا ہے۔

شعیب اختر نے 1997ء میں ویسٹ انڈیز کے خلاف راول پنڈی ٹسٹ میں اپنے کریئر کا آغاز کیا۔ ورلڈ کپ سے پہلے تک شعیب اختر نے 10 میچوں میں 27 وکٹ 19.48 کی اوسط سے حاصل کیے۔ ان کی بہترین باؤلنگ 4/38 ہے۔ اس ورلڈ کپ میں انہوں نے 16 وکٹ حاصل کیے جس میں آسٹریلیا کے کپتان اسٹیو وا کی وکٹ جس میں اس کو بولڈ کیا شائقین کرکٹ ہمیشہ یاد رکھیں گے۔

شاہد خان آفریدی اور شعیب اختر دنیائے کرکٹ کے دو اہم نام ہیں۔ شائقین کرکٹ ان کے شان دار کارناموں کو ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ ہار اور جیت کو ایک طرف رکھتے ہوئے ان دونوں کی انفرادی کارکردگی پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ بلاشبہ یہ دونوں نام پاکستان کی شہرت اور وقار کی علامت ہیں۔

...500 روپے
[illegible]
[illegible]
...اگست 1995ء

مجرم کون؟

شیخ عبدالمنان شہر کا مشہور زرگر تھا۔ اس کے ہاں ایک ملازم بھی کام کرتا تھا جو خوب طاقت ور اور ہٹا کٹا تھا مگر اس کے سر کے بال پیدائشی طور پر بھورے تھے۔ وہ دن کو شیخ کے ساتھ دکان میں ہوتا تھا اور رات کو اس کی کوٹھی کے ساتھ کوارٹر میں رہتا تھا۔ ایک رات شیخ عبدالمنان کو کسی نے قتل کر دیا۔ قاتل نقدی اور زیورات لے کر بھاگ گیا۔ تفتیش کے لیے انسپکٹر زاہد کو بلوایا گیا۔ ابتدائی تفتیش میں یہ بات سامنے آئی کہ قتل سے پہلے شیخ کی قاتل سے ہاتھا پائی بھی ہوئی تھی۔ انسپکٹر کو شیخ کے ملازم نے بتایا کہ رات وہ اپنے کوارٹر میں گہری نیند سو رہا تھا۔ لہٰذا اسے اس بات کا کچھ علم نہیں کہ شیخ صاحب کو رات کس وقت، کس نے، کس طرح قتل کیا۔ لیکن یک دم انسپکٹر زاہد نے مقتول کے ہاتھ میں کوئی چیز دیکھی اور اس ملازم کو مجرم قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہی شیخ عبدالمنان کا قاتل ہے۔ بتائیے انسپکٹر زاہد نے کیسے کھوج لگایا کہ شیخ کا قاتل اس کا یہی ملازم ہی تھا۔

مجرم کون؟

نام ____________________

مقام: ____________________

پورا پتا: ____________________

____

مئی 1999ء میں شائع ہونے والے "معمہ نوین" کا صحیح حل یہ

ہے:

جب انسپکٹر زاہد دانت صاف کر رہے تھے تو انہیں اپنے سامنے لگے ہوئے آئینے میں چور کا عکس نظر آیا تو انہوں نے گھوم کر چور کا ہاتھ پکڑ لیا۔ چور انسپکٹر کو آئینے میں عکس کے نظر آجانے کی وجہ سے معلوم ہو گیا کہ پیچھے سے وار کرنے والا ہے۔

صحیح جواب بھیجنے کی آخری تاریخ 7 جون 1999ء کی شام تک 1216 ساتھیوں نے ارسال کیا۔ جن میں سے 10 ساتھی بذریعہ قرعہ اندازی انعام کے حق دار ٹھہرے۔ ان ساتھیوں کو 50، 50 روپے کی کتابیں دی جا رہی ہیں۔

1۔ طاہرہ خان منڈی بہاؤالدین

2۔ محمد طارق قیصر بہاولنگر

3۔ محمد شہروز خالد اعوان کوہاٹ

4۔ عمار خان فیصل آباد

5۔ رافعہ افتخار لاہور

6۔ [illegible]

7۔ [illegible]

8۔ وسیم احمد مظفر گڑھ

9۔ اسید حسین وہاڑی

10۔ محمد نعیم [illegible]

ان ساتھیوں کے نام بذریعہ قرعہ اندازی شائع کیے جا رہے ہیں:

اسد اللہ فاروق واہ چھاؤنی۔ محمد عدیل ظلی بورے والا۔ قاضی دانیال مصطفیٰ راولپنڈی۔ نعمان واحد کراچی۔ محمد عمر لاہور۔ حفیظہ کفایت اللہ اسلام آباد۔ محمد فیصل نثار لاہور چھاؤنی۔ سویرا کنول اسلام آباد۔ عدنان نوید شیخ کوہاٹ۔ محمد سمیع اللہ الیاس لاہور۔ مریم اکرم لاہور۔ انیلا شہزادی لاہور۔ علینہ مرتضیٰ لاہور۔ محمد رضوان لاہور۔ زینب عبدالرؤف لاہور۔ [illegible] لاہور۔ علی الدین حسن اسلام آباد۔ محمد حسان اظہر لاہور۔ رضوان رشید دانا خانقاہ والا۔ محمد علی اقبال لاہور۔ میمونہ جمال کبیر ملتان۔ عبدالرحمان کوہاٹ۔ تیمور احمد طارق لاہور۔ عظمیٰ عارف لاہور۔ صائمہ شاہد لاہور۔ محمد انیس شاہد [illegible]۔ عمر نعیم رحیم یار خان۔ سارہ اویس لاہور۔ فروا کنول لاہور۔ عدنان حفیظ فیصل آباد۔ محمد مصعب خان چونیاں چھاؤنی۔ اسامہ [illegible]۔ قاضی انس حسین لاہور۔ محمد شعیب ملتان۔ عمیر سعید بہاولپور۔ اظہر ملک پشاور۔ عمر فاروق اٹک۔ فہد متین پشاور۔ جواد مسعود سرگودھا۔ محمد عمران شہزاد حافظ آباد۔ حفصہ الیاس گجرات۔ ساجدہ سعید سرگودھا۔ ارم لطیف لاہور۔ حمیرا اشرف گجرات۔ حافظ محمد عبدالرحیم زبیر لاہور۔ عدیل احمد واہ چھاؤنی۔ غلام مصطفیٰ عابد چونڈہ۔ محمد شعیب چکوال۔ سہیل مزمل باجوہ منڈی بہاؤالدین۔ محمد رضا عنوان۔ سیدہ [illegible] واہ چھاؤنی۔ ندیم احمد اٹک۔ ثوبیہ نورین جہلم۔ حافظ محمد عبدالعزیز قریشی لاہور۔ ماہ وش لاہور۔ حافظ قمر الزمان عبدالحکیم۔ محمد رحمان اعوان ایبٹ آباد۔ محمد محی الدین لاہور۔ کومل مبارک لاہور۔ رابعہ اظہر لاہور۔ عمیرا مشتاق لاہور۔ محمد عمران خالق لاہور۔ عطاء المصطفیٰ تمیل حویلی لکھا۔ احسن افتخار لاہور۔ جنید منیر لاہور۔ بشریٰ فاروق لاہور۔ [illegible] خان اسلام آباد۔ قاضی محمد اولیٰ سیٹھی باغ۔ ثمرہ یاسین فیصل آباد۔ محمد مالک ہجیجہ وطنی۔ عبداللہ خان لاہور۔ مریم واجد لاہور۔ عروج صدیقی لاہور۔ رابعہ سجاد لاہور۔ آمنہ محبوب گوجر خان۔ توشیبہ ارشد اٹک۔ نائلہ یاسین بھیرہ۔ عبداللہ انور وہاڑی۔ فرخ امیر لاہور۔ نعمان شوکت فیصل آباد۔ چودھری محمد عبدالرحمان چاہل فیصل آباد۔ حبیب احمد کلایہ۔ نائلہ مختیار کوہاٹ۔ محمد نصیر احمد فیصل آباد۔ محمد قاسم اقبال فیصل آباد۔ ندیم ہادی حافظ آباد۔ راجہ ظفاقت کومل میرپور۔ تنویر حسین جعفری میرپور۔ نجیب گل لاہور۔ [illegible] محمد بخش کوہاٹ۔ رحمہ قریشی لاہور۔ حسن غفار لاہور۔ محمد مدثر حسین چوہان چوبارہ والا۔ محمد مسعود علی شجوال چھاؤنی۔ فاطمہ ارشد لاہور۔ اویس محمد خان پشاور۔ اسد خان اٹک۔ عبدالرحمان لاہور۔ ذی شان علی [illegible] تالی۔ اویس حبیب جہلم۔ راحیل احمد کلور کوٹ۔ مریم شفیع لاہور۔ سائرہ بانو ظیم [illegible]۔ محمد رضا طارق اسلام آباد۔ حسن رضا راولپنڈی۔ محمد عمران نبیل فیصل آباد۔ خالد شہزاد راولپنڈی۔

دلچسپ اور ناقابلِ یقین

مرتبہ: ستار خان طاہر

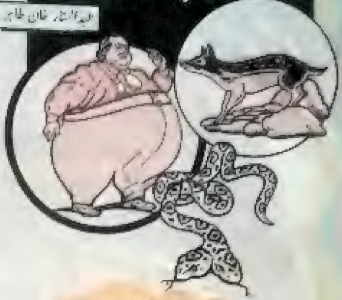

سزا کے بعد

ایک دفعہ شہنشاہ جہاں گیر نے اپنے لڑکے شہزادہ خسرو کی بغاوت کے جرم میں آنکھیں نکال دینے کا حکم دیا۔ شہزادے نے جہاں گیر کے سامنے رحم کی اپیل کی اور آنکھیں نکلوانے کے بجائے خود اپنے ہاتھوں سے اپنی آنکھوں کے پپوٹے لوہے کی ایک گرم سوئی سے سی لیے۔ اس طرح شہزادے کی دونوں آنکھیں بند ہو گئیں۔ ایک سال بعد بادشاہ نے اس کی سزا معاف کردی اور پھر نامی گرامی جراحوں نے نہایت ہی احتیاط اور کام یابی سے اس کی آنکھوں کے گرد موجود دھاگے کاٹ ڈالے اور شہزادے کی آنکھیں آہستہ آہستہ پھر روشن ہو گئیں۔

آدھا انڈا

ہالینڈ کی ایک خاتون "مسز رولی میکس" نے ایک بطخ پال رکھی ہے جو ہمیشہ آدھا انڈا دیتی ہے۔ انڈے میں آدھی زردی ہوتی ہے۔ بالکل ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے درمیان میں سے انڈے کے دو ٹکڑے کر دیے ہوں۔ ایک بار مسز رولی میکس نے 10 انڈے جمع کر کے ان میں سے بچے نکلوانے کی کوشش کی۔ لیکن انڈے خراب ہو گئے۔ صرف ایک انڈے میں سے بچہ نکلا جو کہ آدھا تھا اور مرا ہوا تھا۔ اب یہ بطخ وہاں کے سائنس دانوں کے تجربات کا نشانہ بنی ہوئی ہے۔ دیکھیں وہ کیا نتیجہ نکالتے ہیں۔

انسانی بھیڑیا

1954ء کا ذکر ہے کہ برصغیر پاک و ہند کے اخبارات میں رامو نامی ایک بچے کی کہانیاں ایک عرصے تک شائع ہوتی رہیں۔ رامو جنگل میں بھیڑیوں کے درمیان پرورش پانے والا بچہ تھا۔ کسی کو معلوم نہیں کہ وہ جنگل میں کس طرح پہنچا۔ ممکن ہے کسی غریب ماں نے اسے سفر کے دوران میں جنگل میں چھوڑ دیا ہو۔ اس جنگل میں بھیڑیے عام تھے۔ لیکن رامو کسی بھیڑیے کا نوالہ نہیں بنا۔ کسی مادہ بھیڑیے نے اسے "گود" لے لیا اور اسے اپنے دودھ سے پال کر انسانی بھیڑیا بنا دیا۔ ظاہر ہے کہ دوسرے بھیڑیے بھی اسے اپنا بچہ سمجھتے رہے ورنہ کوئی بھی دوسرا بھیڑیا اسے کھا سکتا تھا۔ ایک روز چند آدمیوں نے جنگل میں ایک ننگ دھڑنگ لڑکا دیکھا جو بھیڑیوں کی طرح غراتا اور کاٹنے کو دوڑتا تھا۔ انھوں نے اسے عجیب مخلوق سمجھ کر پکڑ لیا اور رسیوں سے باندھ کر شہر میں لے آئے۔ پھر اسے ایک ہسپتال میں ہندوستان کے چوٹی کے ڈاکٹروں اور سائنس

دانوں کی نگرانی میں دے دیا گیا۔ رامو اپنی گرفتاری کے کئی ماہ بعد تک زندہ رہا۔ دنیا کے بڑے بڑے ملکوں کے ڈاکٹر، ماہرین اور سائنس دان اس بچے کو دیکھنے کے لیے آتے رہے۔ ڈاکٹروں کی کئی ماہ کی جدوجہد کے باوجود رامو انسانی تہذیب سیکھنے پر آمادہ نہ ہوا۔ وہ پہلے کی طرح کچا گوشت کھاتا رہا اور اپنے ہم نسل انسانوں سے اس کی بے زاری اسی طرح برقرار رہی۔ بڑے عرصے کے بعد وہ سبزیاں کھانے پر رضامند ہوا لیکن وہ انسانی زبان کا کوئی لفظ نہ سیکھ سکا۔ بھیڑیوں کی طرح غرانا ہی اس کی زبان تھی۔ اس طرح ڈاکٹروں کی طویل جدوجہد ناکام ہو گئی۔ وہ رامو کو دوبارہ انسان نہ بنا سکے اور آخر کار رامو بیمار ہو کر مر گیا۔

لڑکی کے جسم میں کرنٹ

جرمنی کے شہر برلن کے نزدیک ایک گاؤں میں "جینی مارگن" نامی ایک لڑکی کے جسم میں بجلی موجود تھی۔ یہ 1877ء کا واقعہ ہے کہ جینی مارگن کے جسم میں اچانک ایک دن یہ عجیب و غریب طاقت پیدا ہو گئی۔ اب جو کوئی بھی اسے ہاتھ لگاتا تھا، اسے بجلی کی طرح جھٹکا محسوس ہوتا تھا۔

اتنا لمبا کیمرا

1899ء میں تاریخ کا سب سے بڑا کیمرہ بنایا گیا جو ایک پوری گاڑی کا تفصیلی فوٹو لے لیتا تھا۔ اس کیمرے کا وزن 1400 پونڈ تھا۔ اس کی لمبائی 20 فٹ تھی۔ اس کیمرے میں 8×10 سائز کا نیگٹو استعمال ہوتا تھا۔

خون سے دستخط

شروع شروع میں جاپان کے شہنشاہ اپنے فرمان پر دستخط کرنے کے بجائے انسانی خون میں ہاتھ ڈبو کر نیچے نشان بنا دیا کرتے تھے۔ دستخط کا یہ انداز نہ صرف نرالا تھا بلکہ اس کی نقل بھی ناممکن تھی اور اسے مٹایا نہیں جا سکتا تھا۔

امن کی گھنٹی

فرانس کے شہر نانگ میں دوسرے ہزار سالہ دور کے خاتمے کے موقع پر عالمی امن کی ایک یادگار گھنٹی تیار کی گئی ہے جس کا وزن 30 ٹن سے بھی زیادہ ہے۔ اس گھنٹی کو دنیا میں امن کی علامت کے طور پر بجایا گیا۔

سمندر میں شہر

جاپان جزیرہ بھی ہے اور پہاڑی علاقہ بھی۔ اس کے پاس زمین ویسے بھی کم ہے لیکن صنعتی ترقی نے اس کے ہاں زمین اور کم بلکہ ایک حد تک ختم کر دی ہے۔ اب سائنس دان یہ منصوبہ بنا رہے ہیں کہ سمندر پر ایک شہر آباد کیا جائے۔ شہر کا رقبہ 33 مربع کلومیٹر ہو گا اور اس کے بسانے پر چار ارب ڈالر تک یا اس سے زیادہ بھی خرچ ہو سکتے ہیں۔ اس میں 5 لاکھ سے 10 لاکھ مزدور کام کریں گے اور یہ شہر 600 فٹ پانی کے اندر ہو گا۔ اس کی چار منزلیں پانی کے باہر بھی ہوں گی۔ منصوبے کے مطابق اس کی تکمیل 10 سال میں متوقع ہے۔ یہ شہر ٹوکیو کے قریب لنگر انداز ہو گا۔

محمد عمر سلیم

دل چسپ کھیل بغیر خرچ کے

چور ساد ھ

ایک چھوٹا سا پتھر لے کر اسے رنگ کر لیں تاکہ وہ ایک مخصوص پتھر بن جائے۔ اب ٹپ کر کے ایک بچہ چور بن جائے اور آنکھیں بند کر کے کھڑا ہو جائے۔ باقی بچے آپس میں چپکے چپکے فیصلہ کریں کہ وہ مخصوص پتھر کس بچے کی مٹھی میں ہو گا۔ ویسے اپنی مٹھیاں سب بچے بند کر لیں اور چور بچہ آنکھیں کھول لے۔

سارے بچے پوچھیں "پتھر کہاں ہے؟" اور اپنی اپنی بند مٹھیاں اسے دکھائیں۔ چور بچہ جس بچے کو کہے "پتھر یہاں ہے" وہ بچہ دوڑنا شروع کر دے۔ جو بچہ چور بنا ہے اسے بھاگ کر پکڑے اور اس کی بند مٹھی کھول کر دیکھے۔ اگر پتھر اس کے پاس ہو تو وہ بچہ چور بن جائے گا اور اگر اس کے پاس نہیں ہے تو سادھ بن کر ایک طرف کھڑا ہو جائے گا۔ اسی طرح اسے باقی تمام بچوں کو دوڑ دوڑ کر پکڑنا ہو گا اور ان کی مٹھی کھول کر پتھر ڈھونڈنا ہو گا۔ اگر پتھر نہ ملے تو وہ بچے سادھ بنتے جائیں گے۔ مگر جس کی مٹھی سے مل جائے گا وہ چور بن جائے گا اور کھیل پھر پہلے کی طرح شروع ہو جائے گا۔

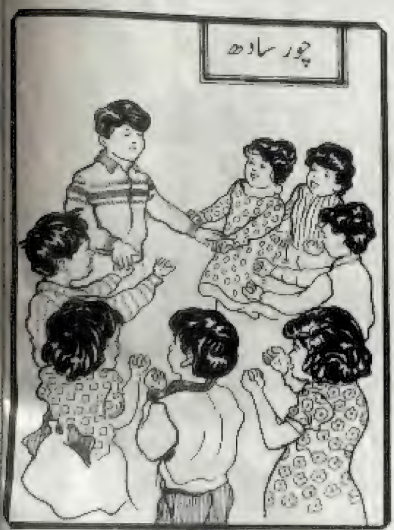

محاورہ مکمل کیجیے

بچے اس کھیل میں دو برابر تعداد کی ٹیمیں بنا لیں۔ کھیل شروع کرنے کے لیے دونوں ٹیمیں آمنے سامنے بیٹھ جائیں اور ٹپ کر فیصلہ کریں کہ کھیل کون سی ٹیم شروع کرے گی۔ جو ٹیم کھیل شروع کرے وہ کسی بھی محاورے کا آدھا حصہ بول دے۔ جو شروع کا آدھا بھی ہو سکتا ہے اور

آخر کا حصہ۔ دوسری ٹیم اس محاورے کو مکمل کرے۔ اگر نہ مکمل کر سکے تو وہ ایک پوائنٹ کھو دے گی۔ اس کے بعد وہ پہلی ٹیم سے کسی اور محاورے کا آدھا حصہ بول کر باقی کے حصے کے متعلق پوچھے۔ جو ٹیم محاورے مکمل کرتی جائے گی ایک ایک نمبر حاصل کرتی جائے گی۔ جس ٹیم کے زیادہ نمبر ہوں گے وہ جیت جائے گی۔

بعض دفعہ ایسے بھی ہوتا ہے کہ کوئی ٹیم اپنی طرف سے ہی محاورہ بنا کر پوچھ لیتی ہے۔ یہ فاؤل ہو گا۔ اس صورت میں جھگڑا ہو جاتا ہے۔ جس کو حل کرنے کے لیے فیروز اللغات اردو جامع سے مدد لی جا سکتی ہے۔ اس کتاب میں اردو کے تقریباً سبھی محاورات ترتیب وار موجود ہیں۔ اگر فاؤل ہو تو ایک نمبر کٹ جائے گا۔

الفاظ بنائیے:

یہ کھیل کھیلنے کے لیے سب بچے کاغذ اور پنسل پکڑ لیں۔ اپنا منصف کسی بڑے کو بنا لیں۔ منصف کو کہیں کہ وہ آپ کو انگریزی یا اردو میں کوئی بڑا سا لفظ لکھوا دیں جس میں بہت سارے حروف تہجی آتے ہوں۔ ایک وقت مقرر کر دیں۔ یعنی شروع کرنے کے آدھ گھنٹا یا 15 منٹ بعد سب سے کاغذ لے لیے جائیں گے۔

بچوں کا کام یہ ہو گا کہ انھیں کاغذ پر جو لفظ لکھوایا گیا ہے، اس میں سے چھوٹے چھوٹے بہت سے لفظ بنائیں۔ مثلاً پاکستان بڑا لفظ ہے۔ اس سے مندرجہ ذیل چھوٹے لفظ بن سکتے ہیں۔

پاک۔ کیا۔ کپاس۔ پک۔ ان۔ پا۔ پاس۔ پان۔ پکنا۔ سانپ۔ سینا وغیرہ

ایسے ہی یہ کھیل انگریزی میں بھی کھیلا جا سکتا ہے مثلاً

Ant -Net- Pan- Pen = ELEPHANT

-Hat- At- Path وغیرہ لفظ بن سکتے ہیں۔

ایک بڑے لفظ سے چھوٹے لفظ جو بچہ سب سے زیادہ بنائے گا وہ جیت جائے گا۔

فتح

علی اکمل تصور

ڈاکٹر ڈیوڈ سے میری ملاقات لاہور کے ایک پرائیویٹ ہسپتال میں ہوئی تھی۔ وہ ایک بزرگ صورت آدمی تھے۔ سر کے بال برف کی مانند سفید اور آنکھوں پر نفیس چشمہ موجود تھا۔ وہ میٹھی میٹھی باتیں کرتے تھے۔ موٹر سائیکل کے حادثے میں میری ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اور اب میں ان کا مریض تھا۔ پہلے دن جب میری ان سے ملاقات ہوئی تو درد کی شدت سے میری جان نکل جارہی تھی۔ میں کراہ رہا تھا اور وہ مجھے ابتدائی طبی امداد دیتے ہوئے مجھ سے نہایت نرم لہجے میں باتیں کررہے تھے۔

"تیور بیٹے..... غلطی معمولی بھی ہو بہرحال غلطی ہوتی ہے اور ہر غلطی کا ردعمل ہوتا ہے۔ اب یہ ردعمل ہی تو ہے کہ اس وقت تم ہسپتال میں ہو۔ لیکن کبھی کبھی غلطیاں اتنی مہلک بھی ہوتیں ہیں کہ جان پر بن جاتی ہے۔ لیکن میں تمہیں بتاؤں کہ ایسی ہی ایک غلطی میری جان بچانے کا سبب بنی تھی"

میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر ڈیوڈ جو ہڈیوں کے ماہر سمجھے جاتے تھے' ان کی اپنی ایک ٹانگ میں تھوڑا سا لنگ موجود تھا اور وہ لاٹھی کے سہارے چلتے تھے۔ تب ہی میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ میں ڈاکٹر ڈیوڈ سے معلوم کروں کہ وہ کون سی غلطی تھی جو ان کی جان بچانے کا سبب بنی تھی نیز ایک ڈاکٹر ہونے کے باوجود وہ لاٹھی کا سہارا لینے پر کیوں مجبور ہیں۔ اس دن تو میں ان سے کوئی بات نہ کر سکا لیکن یہ بات سوچ کر مطمئن ہوگیا کہ اب میرا اپنی ٹوٹی ٹانگ کی وجہ سے ہسپتال تو آنا جانا لگا ہی رہے گا' کسی نہ کسی دن ان سے بات کرنے کا موقع مل ہی جائے گا اور یہ موقع آج مل گیا تھا۔

آج میری ٹانگ کا پلاسٹر کھولا جانا تھا اور اتفاق سے ڈاکٹر ڈیوڈ کے کمرے میں کوئی اور مریض بھی موجود نہیں تھا۔

"ڈاکٹر صاحب' آپ اپنے کام میں بہت ماہر ہیں پھر آپ نے پاکستان میں سروس کرنا کیوں گریسند کیا؟" میں نے بات کا آغاز کیا تو وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگے۔

"..... سر میں دراصل یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے ہاں کوئی فرد جب اپنے کام میں ماہر ہو جاتا ہے تو پیسا کمانے کی خاطر دوسرے ملک چلا جاتا ہے لیکن آپ وہاں سے یہاں چلے آئے۔ یہ بات میرے لیے بہت حیرت انگیز ہے....." میں نے اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔

وہ چند لمحوں تک تو خاموش کچھ سوچتے رہے پھر بولے "تم نے درست کہا..... یہ پاکستان کی بدقسمتی ہے کہ یہاں پر زیادہ تر لوگ اپنے مفادات کے حق میں سوچتے ہیں۔ لیکن پھر بھی پاکستان سے محبت رکھنے والوں کی یہاں کمی نہیں۔ جہاں تک میری بات ہے۔ میں نے زندگی کی حقیقتوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ زندگی کا اصل سکون انسانیت کی خدمت کرنے میں چھپا ہوا ہے اور اسی خدمت کا جذبہ لیے میں یہاں پاکستان چلا

آیا..."۔

"لیکن یہ خدمت آپ وہاں اپنے ملک میں اپنے عوام کی بھی کر سکتے تھے..."

"ہاں کر سکتا تھا لیکن یہاں ایک ایسی بات ہے جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔ وہاں یورپ میں ہر آدمی کے سینے میں دل نہیں ڈالر دھڑکتا ہے۔ دل تو یہاں پاکستان کے لوگوں کے سینوں میں دھڑکتے ہیں۔ وہ لوگ اپنا کام نکالنے کے بعد ڈالر پھینکتے ہیں اور آگے بڑھ جاتے ہیں۔ لیکن یہاں کے لوگ اپنے مسیحا کو دولت کے ترازو میں نہیں تولتے۔ پیار کے جواب میں پیار دیتے ہیں۔ میری خدمت کو یہ لوگ احسان کا نام دیتے ہیں۔ پھر میں اپنی صلاحیتیں ان لوگوں کے لیے کیوں نہ وقف کروں جو مجھ سے پیار کرتے ہیں..."۔

آپ کی بات درست ہو گی۔ لیکن آپ بھی تو اسی دنیا کے آدمی ہیں۔ آپ کی بھی تو ضرورتیں ہوں گی' خواہشیں ہوں گی..."

میری بات سن کر وہ کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ "تم بہت معصوم ہو میرے عزیز' وہاں یورپ میں جیولری کی سب سے بڑی دکان میری ہے۔ ہم لوگ ہیرے تراشتے ہیں اور ہمارے ہاں جو ہیرے تراشے جاتے ہیں عالمی منڈی ان کی خریدار ہے۔ دنیا کے تمام وسائل دستیاب ہیں۔ لیکن میں نے ابھی تمہیں بتایا ہے کہ میں نے زندگی کی حقیقتوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اس لیے اب دولت میں میرے لیے کوئی خاص کشش نہیں رہی..." یہ کہتے ہوئے وہ اداس ہو گئے۔

"اس دن آپ بتا رہے تھے کہ ایک غلطی آپ کی جان بچانے کا سبب بن گئی تھی"۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ وہ مسکرائے اور چھوٹی سی مشین سے میری ٹانگ کا پلاسٹر کاٹتے ہوئے بولے۔ "میں ایک ذہین طالب علم تھا۔ میرے ابو پوری دنیا میں ہیرے تراشنے کے سب سے بڑے ماہر سمجھے جاتے تھے اور میں بھی یہ کام سیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن میرے ابو کی خواہش تھی کہ میں ڈاکٹر بنوں۔ میں نے ان کی خواہش پر اپنی خواہش کو قربان کر دیا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اچھے بچے وہی ہوتے ہیں جو اپنے والدین کی خواہشوں کا احترام کریں۔ اس کے بعد میں پوری لگن سے تعلیم حاصل کرنے لگا۔ وقت گزرتا رہا۔ میں جوان ہو گیا اور میری تعلیم بھی مکمل ہو گئی۔ اب میں ایک ہسپتال میں جونیر ڈاکٹر کی حیثیت سے کام کرنے لگا تھا۔ میرے والد صاحب ضعیف ہو چکے تھے۔ ان کے ہاتھ کانپنے لگے تھے اور اب وہ ہیرے تراش نہیں سکتے تھے۔ ایسے حالات میں میرے ابو نے اپنی دکان میں ایک نیا ملازم رکھا۔ اس کا نام البرٹ تھا۔ وہ اعلیٰ درجے کا کاری گر تھا۔ اس کے آنے سے میرے ابو خاصے مطمئن ہو چکے تھے۔ ہمارا کام خوب ترقی کر رہا تھا۔ لیکن پھر ایک سانحہ ہو گیا۔ میرے ابو چند روز بیمار رہ کر چل بسے۔ اب ان کی ساری جائیداد اور مال و دولت کا میں اکیلا وارث تھا۔ والد صاحب کی خواہش کی تکمیل میں میں اپنا آبائی کام سیکھ نہیں سکا تھا اور دکان کے سارے معاملات البرٹ کے ہاتھ میں تھے۔ وہ میرا ہم عمر تھا اور ہمارے خیالات بھی ایک جیسے تھے۔ اس سے میری بڑی گہری دوستی ہو گئی۔ ہم ہمیشہ پاس پاس رہتے اور ہر جگہ ایک ساتھ نظر آتے۔ اسے کوہ پیمائی کا جنون تھا اور وہ مختلف تنظیموں میں شامل ہو کر بہت سے چھوٹے بڑے پہاڑوں کی چوٹیاں بھی سر کر چکا تھا۔ اس کی باتیں سن کر میں بھی بے چین ہو جاتا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ رسہ پکڑوں' حفاظتی لباس پہنوں اور پہاڑ پر چڑھ جاؤں لیکن تربیت کے بغیر یہ سب ممکن نہیں تھا۔

پھر ایک روز میں نے البرٹ سے اپنی اس خواہش کا اظہار کر دیا۔ وہ میری بات سن کر اچھل پڑا۔ "تم... تم پہاڑ پر چڑھو گے... تم کوہ پیما بنو گے۔ میں تمہاری مدد کروں گا اور ہم دونوں مل کر "کے ٹو" فتح کریں گے۔ اس کے بعد ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی کو اپنے قدموں کے نیچے روند کر رکھ دیں گے..."۔ وہ جوش سے بول رہا تھا اور میرے خون کی گردش تیز ہو رہی تھی۔ پھر اس نے مجھے ایک کلب میں داخلہ دلا دیا۔ میں ہر بات سے لاپروا ہو چکا تھا۔ ڈاکٹری کی پریکٹس بھی ادھوری رہ گئی تھی۔ اب میں تھا' کوہ پیمائی کا جنون تھا اور البرٹ میرے ساتھ تھا۔ اس نے میری دکان کا سارا کام سنبھال لیا تھا۔ وہ ہیرے تراشنے میں میرے ابو سے زیادہ کمال حاصل کر چکا تھا۔ وہ ہیرے کو اس

طریقے سے تراشتا تھا کہ اس کے خام وزن میں سے چند رتی وزن ہی کم ہوتا تھا اور پتھروں سے منعکس ہونے والی روشنیوں پر نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ اس کے کام سے خوش ہو کر میں نے اسے اپنی دکان میں حصہ دار بنا لیا۔

ایک سال گزر چکا تھا اور میری تربیت مکمل ہو چکی تھی۔ اب ہم تھے اور چٹیل پہاڑ تھے۔ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر مجھے بہت سکون ملتا تھا۔ میرے لیے یہ احساس بہت فرحت بخش ہوتا تھا کہ میں بلندی پر موجود ہوں اور دنیا والے مجھ سے بہت نیچے ہیں۔ لیکن جب میں اپنے اردگرد دیکھتا تو اداس ہو جاتا۔ میری آنکھوں کے سامنے ہمالیہ کے پہاڑوں کا وسیع سلسلہ موجود تھا اور یہ برف پوش پہاڑ بہت بلند تھے۔ یہ مجھے چیلنج کرتے تھے کہ آؤ اور ہمیں سر کر کے دکھاؤ۔ پھر میرے دل کی خلش اور بھی گہری ہو جاتی تھی۔

"البرٹ ہمارا اگلا سفر اس پہاڑ کی طرف ہو گا..." میں نے البرٹ کو اپنی جانب متوجہ کیا۔

البرٹ نے برف پوش پہاڑ کی طرف دیکھا اور بولا "یہ کے ٹو ہے۔ دنیا کا دوسرا بلند ترین پہاڑ... لیکن اگر تمہاری خواہش ہے تو ہم اسے فتح کرنے کے لیے آگے بڑھتے ہیں..."

اس کی بات سن کر میں خوش ہو گیا۔ ایک مہینے تک آرام کرنے کے بعد ہم نئے ولولے کے ساتھ اپنے اس سفر پر روانہ ہوئے۔ اخبارات میں ہماری روانگی کی خبریں شائع ہو چکی تھیں اور تمام انتظامات مکمل تھے۔

وادی میں ہمیں الوداع کہنے کے لیے بہت سے لوگ تھے۔ ٹی وی کیمرے ہماری مووی بنا رہے تھے اور پھر ہم اپنی منزل کی طرف روانہ ہوئے۔ پہلا دن تو باتوں میں ہی تمام ہو گیا اور ہم بغیر کسی سہارے کے آگے بڑھتے رہے۔ لیکن دوسرے دن راستہ قدرے دشوار ہو گیا۔ ہم نے فل بوٹ پہن لیے اور اب ہمارے ہاتھوں میں نوکیلے اوزار تھے۔ سفر جاری تھا۔ البرٹ خاموش تھا۔ یوں جیسے کسی گہری سوچ میں گم ہو۔ میری باتوں کا جواب وہ ہاں ناں کے انداز میں دے رہا تھا۔ رات ہوتے ہی ہم نے ایک ہموار جگہ پر ٹینٹ لگایا اور ڈبوں میں سے کھانا نکال کر گرم کرنے لگے۔ ہوا خاصی سرد تھی۔ سورج طلوع ہونے میں ابھی دو گھنٹے باقی تھے کہ برف گرنے لگی۔ ہم نے اٹھ کر گرم لباس پہنا اور پھر آگ جلا کر بیٹھ گئے۔ صبح کی روشنی پھیلی تو ہم اپنے خیمے سے باہر نکلے۔ آسمان پر سفید بادل چھائے ہوئے تھے۔ چار سو برف پھیلی ہوئی تھی۔ موسم اچانک ہی خراب ہو گیا تھا۔ سفید دھوئیں نے ہمیں اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اب ہم سست رفتاری سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ سردی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ہم نے حفاظتی لباس پہن لیا۔ آنکھوں پر مخصوص چشمے بھی لگا لیے۔ ہم مسلسل آگے بڑھ رہے تھے۔ اب دن میں بھی برف گرنے لگی تھی۔ ہم دن بھر میں بڑی مشکل سے سو فٹ کا فاصلہ طے کر پاتے تھے۔ اس کے بعد ہماری ہمت جواب دے جاتی۔

اور پھر میری زندگی کے بھیانک ترین دن کا آغاز ہوا۔ خراب موسم کی وجہ سے ہمارا رابطہ زمین والوں سے ٹوٹ گیا۔ وائرلیس سیٹ ناکارہ ہو چکے تھے اور ہم سست رفتاری سے آگے بڑھ رہے تھے کہ اچانک مجھے احساس ہوا کہ البرٹ میرے ساتھ نہیں ہے... میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ سفید بادلوں میں دھندلا دھندلا سا نظر آ رہا تھا۔

"البرٹ..." میں نے چیخ کر کہا۔ وہ چشمے کے پیچھے سے مجھے گھور رہا تھا "مجھے تم سے کچھ کہنا ہے ڈیوڈ..." وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

"ہاں میں سن رہا ہوں..." میں نے کہا۔ مگر میں اس کے اس رویے پر بہت حیرت زدہ تھا۔ پھر اس نے اپنی شرٹ کی زپ کھولی اور چند کاغذات نکال لیے۔

"یہ کاغذات میں تمہارے لیے لایا ہوں ڈیوڈ..." اس نے کاغذات میری طرف بڑھا دیے۔ میں نے کاغذات پکڑے اور صدمے کی شدت سے جیسے میرے دل نے دھڑکنا چھوڑ دیا ہو۔

"یہ... یہ کیا ہے؟" میں نے بے یقینی سے کہا۔

البرٹ سفاکی سے مسکرایا اور بولا "ان کاغذات میں لکھا ہے کہ تم اپنی خوشی سے اپنی ساری جائیداد کا مالک مجھے بنا رہے ہو۔ اس پر تاریخ ان دنوں کی ہے جب ہم یورپ میں موجود

تھے۔ بس اب تم فی الفور یہاں اپنے دستخط کردو۔ میں یہاں سے واپس جاؤں گا اور لوگ یہی سمجھیں گے کہ تم نے یہ کام اپنی مرضی اور خوشی سے کیا ہے اور مجھ پر کوئی شک نہیں کرے گا۔"۔

"لیکن میں تو زندہ ہوں۔ میں تمہاری سازش کامیاب نہیں ہونے دوں گا" میں نے غصے میں چلا کر کہا۔

"تم بے وقوف ہو...." البرٹ ہنسا۔

"تم سے دستخط لینے کے بعد میں تمہیں یہیں برف میں دبا دوں گا اور واپس جا کر کہوں گا کہ تم خراب موسم کا شکار ہو کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے"۔

"تو کیا تم مجھے مار ڈالو گے...."۔

"اب اس بات میں کیا شک رہ گیا ہے...."۔

"اگر یہی بات ہے تو پھر میں دستخط نہیں کروں گا۔ مرنا ہی ہے تو پھر تمہارا مقصد بھی پورا نہیں ہونا چاہیے" میں نے پرعزم لہجے میں کہا۔ میں نے ابھی بات بمشکل مکمل کی تھی کہ البرٹ نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں موجود لوہے کی چھڑی سے مجھے دھنک کر رکھ دیا۔ "دستخط کرتے ہو یا نہیں...." ہر وار کے ساتھ وہ مجھ سے پوچھتا اور میں نفی میں سر ہلا دیتا۔ سخت سردی اور درد کی شدت سے میں نڈھال ہو کر رہ گیا۔ البرٹ کو بھی اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اب وہ میری ٹانگ پر وار کر رہا تھا۔ پانچویں وار میں ہی میری ہڈی کریک ہو گئی اور میری سکت بھی ختم ہو گئی۔ پھر میں چیخ اٹھا۔

"اوکے میں دستخط کرتا ہوں" وہ مسکرایا اور کاغذات میری طرف بڑھا دیئے۔ میں نے کاغذات پکڑ لیے اور اس کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی جیب میں سے قلم نکال رہا تھا۔ پھر اس نے قلم بھی میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میرا ہاتھ لرز رہا تھا۔ چند لمحے گزر گئے اور پھر مردہ دل سے میں نے مخصوص جگہ پر دستخط کر دیئے لیکن دوسرے ہی لمحے میں چونک پڑا۔ سیاہی نیچے نہیں اتری تھی۔ میں نے جہاں دستخط لیے تھے وہ جگہ ویسی ہی کوری تھی۔ سردی کی شدت سے روشنائی قلم میں ہی جم کر رہ گئی تھی۔ البرٹ نے مجھ سے قلم چھینا اور پھر اسے جھاڑنے لگا لیکن قلم میں سے روشنائی کا ایک قطرہ بھی باہر نہ نکلا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے لیٹے لیٹے اپنی ٹانگ گھما کر اس کے پیٹ میں دے ماری۔ وہ صدمے کی شدت میں مجھ سے غافل ہو گیا تھا۔ اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ لڑکھڑاتے ہوئے کھائی میں گرا اور میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس کی اس غلطی سے میری جان بچ گئی لیکن میں نے اسے دوست سمجھا تھا۔ بھائی جانا تھا۔ مگر اب میرا دل پتھر ہو گیا تھا۔ اس کے بعد میں واپس اپنے وطن نہیں لوٹا کیوں کہ میرا دل وہاں کی دوستی سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ وہاں میری بہن ہے جو دکان کا کام سنبھالے ہوئے ہے اور میں کے ٹو تو سر نہیں کر سکا البتہ لوگوں کی خدمت کر کے ان کے دلوں کو سر کر رہا ہوں اور میرے خیال میں یہ بہت اچھا کام ہے۔ کیوں ٹھیک ہے نا...." وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ اور پھر میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ دلوں کو فتح کرنا واقعی پہاڑوں کو سر کرنے سے بہتر ہے۔

آپ بھی لکھیے

قدر و قیمت

رحمت اللہ بشیر' گجرات

آزادی ہے شان ہماری' آزادی ہے آن ہماری
آزادی پر ہم سب قربان' دیس ہمارا پاکستان

فیصل کی عمر 10 سال تھی۔ وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا اپنا سبق یاد کرتے ہوئے نظم پڑھ رہا تھا۔ جب وہ اس بند پر پہنچا تو سوچنے لگ پڑا "یہ آزادی کیا ہوتی ہے؟

"دادا جان 'یہ آزادی کیا چیز ہوتی ہے؟" فیصل نے دادا جان سے پوچھا جو صوفے پر بیٹھے کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔

"دیکھو فیصل 'آزادی کا مطلب ہوتا ہے کہ آدمی کسی کی قید میں نہ رہے اور ہر کام اپنی مرضی اور فائدہ کے لیے کرے۔ جیسے پاکستان نے آزادی حاصل کی ہے"۔

"تو کیا دادا جان پاکستان پہلے غلام تھا' کسی کا؟"

"ہاں بیٹے 'انگریزوں کا غلام تھا جو یہاں تجارت کے بہانے آئے اور مسلمانوں کو دھوکا دے کر یہاں کے حکمران بن بیٹھے۔ پھر مسلمانوں نے انگریزوں اور ہندوؤں کے خلاف متحد ہو کر کام کیا اور پاکستان بنا کر ہی دم لیا"

"دادا جان! کیا آپ نے بھی پاکستان کی آزادی کے لیے کام کیا؟" فیصل نے پوچھا

"ہاں بیٹے! پاکستان کی آزادی کے لیے ہم نے بڑی محنت کی۔ پاکستان بننے سے پہلے ہمارا خاندان امرتسر میں تھا جو اب بھارت میں ہے۔ ہمارا خاندان 15 افراد پر مشتمل تھا۔ میرے امی ابو 'چچا' چچی جان' پھوپی' بہن اور میں۔ میں ان دنوں اسکول میں پڑھتا تھا۔ ہم نے اسکول میں پاکستان کی آزادی کے لیے خوب جلسے کیے اور جلوس نکالے۔ ہر ایک کی زبان پر ایک ہی نعرہ تھا

"لے کے رہیں گے پاکستان' بٹ کے رہے گا ہندوستان"

آخر کار قائد اعظم اور ان کے ساتھیوں کی دن رات کی محنت سے پاکستان نے آزادی حاصل کر لی۔ ہر مسلمان علیحدہ وطن حاصل ہو جانے پر بہت خوش ہوا۔ اب ہندوستان میں رہنے والے مسلمان اپنے ملک پاکستان آنا چاہتے تھے۔ ادھر جب پاکستان بن گیا تو ہندوؤں کا غصہ دوچند ہو گیا"۔

"یہ دوچند کیا ہوتا ہے' دادا جان؟" فیصل نے پوچھا

"دوچند کا مطلب ہے پہلے سے زیادہ"۔

پھر دادا جان نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "بیٹا! ہندوؤں نے مسلمانوں پر ظلم کی انتہا کر دی۔ مسلمانوں کو خوب لوٹا' ان کے گھروں کو آگ لگا دی۔ عورتوں بچوں اور بوڑھوں کو بے دریغ قتل کیا۔ ہمارا گھر ہندوؤں کے علاقے میں تھا۔ بس پھر کیا تھا' ہندو تو میرے تحریک پاکستان میں کام کرنے کے پہلے ہی سخت مخالف تھے' لہٰذا انہوں نے سب سے پہلے ہمارے گھر پر حملہ کیا۔ اس وقت گھر میں ابو' امی' پھوپھی جان اور میری بہن تھی' انھوں نے ان سب کو شہید کر دیا۔ میں ان کے ہاتھوں بچ گیا۔ کیوں کہ میں اس وقت گھر نہ تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں گھر جا کر سارے گھر والوں کو ساتھ لے لوں۔ مگر راستے میں مجھے ایک شخص نے وہاں جانے سے روک دیا اور ساری صورت حال سے آگاہ کیا کہ تمہارے سارے گھر والوں کو شہید کر دیا گیا ہے۔ یہ سن کر میرے ہوش قابو میں نہ رہے۔

پھر میں پاکستان جانے والے ایک قافلے سے جا ملا۔ میں ساری راہ روتا رہا۔ میرے قافلے والوں کے ساتھ بھی ہندوؤں نے ایسے ہی ظلم کیے تھے۔ کوئی فرد ایسا نہ تھا جس کا کوئی نہ کوئی عزیز شہید نہ ہوا ہو۔ راستے میں ہم نے بڑی تکلیفیں برداشت کیں۔ بھوک'

رہاں، تھکن۔ گویا ایک ایک لمحہ بڑی مشکل سے کٹ رہا تھا اور سب سے بڑا خوف ان ہندوؤں کا تھا جو گروہ کی صورت میں تلواروں سے لیس ہو کر حملے کرتے اور نہتے مسلمانوں کو شہید کر ڈالتے۔ آخر ہم بڑی مشکل کے ساتھ پاکستانی سرحد میں داخل ہوئے۔ پاکستان کے پرچم کو دیکھ کر پورا قافلہ خوشی سے جھوم اٹھا۔ چھوٹے، بڑے، بچے، بوڑھے سب خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ ہم سب نے سجدہ شکر ادا کیا کہ اللہ نے ہمیں آزاد ملک دیا"۔

یہ کہتے ہوئے دادا جان کی آنکھیں نم ناک ہو گئیں اور وہ عینک اتار کر رومال سے آنکھیں صاف کرنے لگے اور کہنے لگے "جس پاکستان کی آزادی کے لیے ہم نے اتنی قربانیاں دیں، اپنا سب کچھ اس پر قربان کر دیا۔ آج اس کو مضبوط بنانے کے بجائے ہر طرح سے نقصان پہنچایا جا رہا ہے۔ شاید نقصان پہنچانے والے آزادی کی قدر و قیمت سے آشنا نہیں"

دادا جان یہ کہتے کہتے رک گئے اور ان کا لہجہ گلوگیر ہو گیا۔ فیصل نے آگے بڑھ کر دادا جان سے کہا "دادا جان! میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ ہم آزادی کی قدر کریں گے اور پاکستان کو ایک عظیم ملک بنا کر دم لیں گے"۔

دادا جان نے جب فیصل کی یہ بات سنی تو بہت خوش ہوئے اور اسے اپنے گلے سے لگا لیا اور خوب پیار کیا (پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)

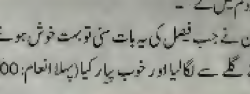

یہی امید تھی

اس نے بسم اللہ پڑھ کر کہانی کا عنوان لکھا جو کچھ یوں تھا "پاکستان کی آپ بیتی" وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے لکھنا شروع کیا۔

"میں پاکستان ہوں، ہاں آپ کا پاکستان، وہی پاکستان جسے قائد اعظمؒ نے حاصل کیا تھا۔ میں 51 سال کا ہو چکا ہوں مگر ابھی تک آپ سے خوش نہیں ہوں۔ رشوت لے کر آپ میرا سودا کر رہے ہیں۔ فائرنگ، دہشت گردی اور لوٹ مار کر کے آپ میرا خون کر رہے ہیں۔ بد دیانتی، جھوٹ، سود اور برے اعمال دیمک کی طرح مجھے چاٹ رہے ہیں۔ ظلم و ستم بھوک اور افلاس نے میری قوت سماعت کو ناکارہ کر دیا ہے"۔

یہاں تک لکھ کر اس کا قلم رک گیا۔ اس نے قلم رکھا، کاپی بند کی اور اٹھ کر کسی کام سے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ ساتھ ہی ڈرائنگ روم تھا۔ اس میں اس کے ابو اور ان کے چند دوستوں کے قہقہے واضح طور پر سنائی دے رہے تھے۔ اچانک قہقہے ختم ہو گئے۔ ڈرائنگ روم میں مکمل سناٹا چھا گیا۔ چند لمحے بعد فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ پہلے تو اسے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔ مگر ابو کی دردناک چیخ نے جیسے اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسا انڈیل دیا ہو۔ وہ دیوانہ وار ڈرائنگ روم کی طرف بھاگا۔ اس نے جو کچھ دیکھا وہ اس کے ہوش اڑانے کے لیے کافی تھا۔ ابو اور ان کے دوست خون میں لت پت پڑے تھے۔

"کیا ہوا ابو؟ یہ سب اچانک کیسے ہوا؟"

"سب... بس بیٹے... یہ سب کچھ اللہ کو منظور تھا" اس کے ابو اٹک اٹک کر بول رہے تھے۔

"یہ سب کس نے کیا؟ کیوں ہوا یہ سب" غصے اور جذبات نے اس کا چہرہ سرخ کر دیا تھا۔

"بیٹے... یہ سب... اس لیے ہوا کہ میں نے رشوت لینے سے انکار کر دیا تھا... میں... رشوت لے کر... اپنی دھرتی کا سودا نہیں کرنا چاہتا تھا" یہ کہہ کر اس کے ابو ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے۔ اس کی چیخیں پورے گھر میں گونج رہی تھیں۔ جب اس کے حواس بحال ہوئے تو اس نے سامنے لگی قائدؒ کی تصویر کی طرف دیکھا۔

"اے قائدؒ... میں آج آپ سے کوئی شکوہ نہیں کروں گا۔ آج میں یتیم ہو گیا ہوں۔ میرے ابو کو رشوت نہ لینے کی وجہ سے قتل کیا گیا۔ انہیں اس لیے قتل کیا گیا کہ وہ سچے پاکستانی تھے۔ اے قائدؒ... میں آج تک اپنے قلم سے ان لوگوں کے خلاف لکھتا رہا جو پاکستان کے... اس دھرتی کے دشمن تھے۔ اور اب بھی میں اس سانحہ کے بعد سچ لکھنا نہیں چھوڑوں گا۔ قلم میرا ہتھیار ہے۔ میں ہر غلط کام کے خلاف یہ ہتھیار اٹھاؤں گا" وہ جذبات میں کہتا چلا گیا۔ اسے یوں لگا جیسے قائدؒ کہہ رہے ہوں "شاباش بیٹے، مجھے تم سے یہی امید تھی"۔ (دوسرا انعام: 90 روپے کی کتابیں)

نافرمانی کا انجام

مثیل مراد، تربت

"شیلہ او شیلہ!" شیلہ کی سہیلیوں نے شیلہ کو آواز دی۔ شیلہ خوشی خوشی باورچی خانے سے نکل کر اپنی سہیلیوں کے پاس چلی گئی۔

"ہاں شیلہ تم تیار ہو؟" شیلہ کی ایک سہیلی نے کہا۔

"ہاں میں تیار ہوں' چلو" شیلہ بولی

شیلہ ابھی گھر سے نکلنے ہی والی تھی کہ اس کی امی نے آواز دی "شیلہ بیٹی کہاں جا رہی ہو بتائے بغیر؟"

"ہیں تم نے اپنی امی سے اجازت نہیں لی؟" شیلہ کی ایک سہیلی نے حیرت سے کہا۔

"اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے' ہم ایک سال کے لیے تھوڑی جا رہے ہیں' 5 منٹ میں ہی تو باہر گھوم پھر کر آ جانا ہے۔ اس کے لیے کیا اجازت لوں" شیلہ نے غصے سے اپنی سہیلی کو گھورتے ہوئے کہا۔

"شیلہ بیٹی جا رہی ہو نا' سنو! تمہارے پاپا آئیں گے تو میں انہیں بتاؤں گی' وہ تمہاری خوب خبر لیں گے"۔

شیلہ نے اپنی امی کی بات کو سنی ان سنی کر دیا اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ قریبی باغوں میں سیر کرنے چلی گئی۔ شیلہ ایک ضدی تتلی تھی۔ وہ ہمیشہ ماں کو بتائے بغیر سہیلیوں کے ساتھ گھر سے نکلتی تھی اور قریبی باغوں میں چلی جاتی تھی۔ باغوں میں طرح طرح کے پھول تھے۔ وہ باغوں کی سیر سے خوب لطف اٹھاتی۔ شیلہ کبھی بھی اپنی ماں سے اجازت نہیں لیتی تھی۔ اسی لیے اسے سہیلیوں کے سامنے شرمندگی اٹھانی پڑتی تھی اور باپ سے بھی ڈانٹ پڑتی تھی۔ آج بھی وہ بتائے بغیر چلی گئی۔ جب وہ سب باغ میں پہنچیں تو انہوں نے وہاں چند بچوں کو بھی دیکھا جو باغ میں کھیل رہے تھے۔ کچھ بچے پڑھ رہے تھے۔ شیلہ سہیلیوں کے ساتھ سارے باغ کا چکر لگا رہی تھی۔ وہ کبھی اس طرف جاتی تو کبھی اس طرف۔ گھومتے گھومتے شیلہ تھک گئی۔ وہ تھوڑا سستانے کے لیے گلاب کے ایک پھول پر بیٹھ گئی۔ اس کی سہیلیاں دوسری طرف چلی گئیں۔ کتابیں پڑھتے ہوئے ایک شریر لڑکے کی نظر شیلہ پر پڑی جو اپنے حسین رنگ برنگے پروں کے ساتھ گلاب کے ایک خوب صورت پھول پر بیٹھی تھی۔ لڑکے کو شرارت سوجھی اور وہ کتاب ہاتھ میں لیے شیلہ کی طرف بڑھا۔ شیلہ ابھی اڑنے ہی والی تھی کہ لڑکے نے اسے دبوچ لیا۔ "ارشد' انور آؤ' میں نے ایک تتلی پکڑی ہے" اس نے اپنے دوستوں کو آواز دی۔

شیلہ بے چاری مسلسل رو رہی تھی۔ دبوچ لینے کی وجہ سے اس کے نازک اور خوب صورت پر ٹوٹ چکے تھے۔ لڑکے نے شیلہ کو اپنی کتاب میں بند کر دیا۔ شیلہ کو اب اپنی ماں کی نافرمانی کا احساس ہو گیا لیکن اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔

(تیسرا انعام: 80 روپے کی کتابیں)

پریشانی یہ ہے

سامیہ شہزادی، راولپنڈی

ہمارے بڑے بھیا' یعنی شاہی بھیا جن کا اصل نام شاہد ہے مگر شاہانہ مزاج کی وجہ سے شاہی کے نام سے جانے' پہچانے اور پکارے جاتے ہیں۔ وہ جب سوتے ہیں تو گھوڑے کیا پورا اصطبل بیچ کر سوتے ہیں۔ لاکھ اٹھانے کے جتن کرو مگر ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ سارا محلہ جاگ جائے مگر بھائی صاحب یونہی نیند کے مزے لیتے رہیں گے۔ اوپر سے اگر بھائی صاحب کا نادر شاہی حکم ہو کہ شام کو 5 بجے مجھے جگا دینا تو مصیبت آ جاتی ہے۔ کیوں کہ اگر بھائی کو پونے پانچ بجے جگانا شروع کریں تو مجال ہے کہ وہ ساڑھے چھ بجے سے پہلے اٹھ جائیں۔ ابھی اٹھتا ہوں' ابھی اٹھتا ہوں کہتے کہتے جب وہ گھنٹا بھر لیٹ اٹھتے ہیں تو ہماری شامت آ جاتی ہے۔

"5 بجے کہا تھا کہ اٹھا دینا' اب 6 بجے اٹھانے آ رہی ہو!" قہر بھری نظروں سے گھورا جاتا ہے اور ہم صفائیاں پیش کرتے رہ جاتے ہیں۔ مگر جناب ہم نے بھی ایک ترکیب ڈھونڈ نکالی۔ بھائی صاحب ایم بی اے کرنے کے بعد بطور شغل ادھر ادھر انٹرویو دیتے پھر رہے تھے۔ ملک میں ویسے ہی نوکریوں کی کمی ہے۔ بھائی جیسے سست الوجود شخص کو کون نوکری دیتا جو انٹرویو دینے والی جگہ پر ڈیڑھ دو گھنٹے لیٹ پہنچتے تھے۔ بہر حال ایک روز ہمیں کہیں سے سن گن ملی کہ بھائی

صاحب کو اگلے دن کسی اچھی فرم میں انٹرویو کے لیے جانا ہے اور انٹرویو کا وقت 8 بجے ہے۔

بھائی صاحب سے تو اس کی امید نہیں تھی۔ 8 بجے تک انٹرویو والی جگہ پہنچنا تو کجا' یہ بھی علم نہیں تھا کہ وہ 8 بجے تک جاگیں گے بھی کہ نہیں۔ لہٰذا ہم نے بھائی کے کمرے کی گھڑی کی سوئیاں دو گھنٹے آگے کر دیں۔ گویا گھڑی 6 نہیں 8 بجا رہی تھی۔ موسم قدرے ابر آلود تھا لہٰذا بھائی کو پتا بھی نہیں چلنا تھا کہ اصل وقت کیا ہوا ہے۔ قدرت مہربان تھی "بھائی' بھائی اٹھیں ساڑھے سات ہو گئے ہیں" ہم نے چلاتے ہوئے بھائی کو اٹھایا۔

"اوں ہوں' سونے دو' تنگ مت کرو" بھائی نیند میں بولے۔

"آپ نے انٹرویو دینے نہیں جانا"

"ارے باپ رے یہ تو ساڑھے سات ہو گئے۔ میں تو وقت پر نہیں پہنچ سکتا۔ پون گھنٹا تو جانے میں ہی لگ جائے گا"۔

"آپ اٹھیں تو سہی"

بھائی بڑی عجلت میں اٹھے اور باتھ روم میں گھس گئے۔ جلدی جلدی تیار ہوئے۔ کمرے سے باہر آئے تو ٹی وی لاؤنج کی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بولے "ہیں ابو نے آنکھ ہوئے ہیں لیکن...."

"وہ...وہ بھائی موسم ابر آلود ہے"

"ہوں" بھائی نے پھر سوچ بھرے انداز میں سر ہلایا۔ آنکھیں ابھی تک نیند میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ "یہ امی کیوں سو رہی ہیں؟" بھائی نے پوچھا۔

"و...وہ...وہ ہاں' وہ ان کے سر میں درد ہے" میں نے ہکلا کر کہا.... بھانڈا پھوٹنے لگا تھا۔

"اچھا میں ابھی دیکھتا ہوں؟" بھائی صاحب تشویش سے بولے۔

"ن... نہیں انہیں مت جگائیں' ابھی لیٹی ہیں"۔

"اچھا" بھائی کے لہجے میں بے یقینی تھی۔ بھائی ناشتا کیے بغیر ہی اپنی موٹر بائیک پر سوار ہو کر تیز رفتاری کے ریکارڈ توڑتے ہوئے انٹرویو والی جگہ پر پہنچ گئے جہاں ابھی جھاڑو دیا جا رہا تھا۔ (ساری تفصیل بھائی نے بعد میں ہمارا کان مروڑتے ہوئے بتائی)۔ بھائی صاحب حیران پریشان کھڑے سارا ماجرا دیکھتے رہے۔ کافی دیر کے بعد ایک شخص پہنچا۔ جو فرم کا مالک تھا اور انٹرویو لینے کے لیے بطور خاص لاہور سے پنڈی آیا تھا۔ بھائی کو انتظار کرتے دیکھ کر وہ بڑا حیران ہوا اور پوچھ بیٹھا۔

"آپ کچھ جلدی نہیں آ گئے" اور بھائی بے چارے ہوں ہاں کرتے رہ گئے۔ لیکن ہوا یہ کہ وہ صاحب' بھائی صاحب کی وقت کی پابندی دیکھ کر متاثر ہو گئے اور انہیں نوکری کی پیش کش کر دی۔ بھائی صاحب مارے خوشی کے وہیں رونے بیٹھ گئے۔ گھر واپس آ کر سب سے پہلے بھائی صاحب نے میری گردن پکڑی

"مجھے ایک گھنٹا پہلے بھجوا دیا' میں وہاں احمقوں کی طرح کھڑا رہا"

نتیجہ کیا نکلا؟" امی نے بے تابی سے پوچھا۔

"ہونا کیا تھا۔ وہ صاحب میری وقت کی پابندی سے متاثر ہو گئے اور مجھے نوکری تھما دی"

"ہیں کیا واقعی؟" میں نے کہا اور بھائی میرا کان مروڑ مروڑ کر کہتے جا رہے تھے۔ "پھنسوا دیا مجھے' تمہارا قصور ہے کہ مجھے نوکری مل گئی۔ نہ وقت سے پہلے بھیجتیں' نہ یہ ہوتا" مجھے تکلیف بھی ہو رہی تھی مگر میں ہنس بھی رہی تھی۔ میری ترکیب رنگ لائی تھی۔ بھائی بھی یقیناً نوکری ملنے پر خوش تھے۔ بس یونہی مذاق کر رہے تھے۔ لیکن ایک پریشانی اب یہ ہے کہ اب جب میں بھائی کو اٹھاتی ہوں اور کہتی ہوں کہ "بھائی اٹھو 8 بج گئے ہیں' دفتر نہیں جانا کیا؟" اور بھائی مندی مندی آنکھوں سے گھڑی کو دیکھتے ہیں۔ جہاں 8 بج رہے ہوتے ہیں تو وہ سمجھتے ہیں کہ اس دن کی طرح پھر میں نے گھڑی آگے کر دی ہوگی اور مجھے قسمیں کھا کھا کر یقین دلانا پڑتا ہے کہ بھائی کو واقعی ہی دیر ہو گئی ہے (چوتھا انعام: 70 روپے کی کتابیں)

عجیب اتفاق

ہم حقیقتاً بہت شرارتی واقع ہوئے تھے۔ ہر روز نئی شرارت سوچنا اور اس پر عمل کرنا ہی ہمارا کام تھا۔ ایک روز ممی اور پاپا کو کسی

کام سے ایک دن کے لیے لاہور جانا پڑ گیا۔ گھر میں صرف میں اور میرا چھوٹا بھائی سفیان رہ گئے۔

ہمارا ذہن تو پہلے ہی شرارتیں سوچنے میں ماہر تھا۔ ممی پاپا کے جاتے ہی ہمارے ذہن میں فوراً ایک خیال آیا کہ کیوں نہ لوگوں کو ٹیلی فون پر تنگ کیا جائے۔ ہم نے ٹیلی فون ڈائریکٹری اٹھائی اور ایک ڈاکٹر صاحب کا فون نمبر ملا کر ان سے کہا "اگر تم نے اپنے مریض اشفاق کا علاج نہ چھوڑا تو بہت برے نتائج بھگتنا پڑیں گے"۔ اسی طرح ہم نے اور بہت سے لوگوں کو بھی دھمکیاں دیں۔ ہم اپنی اس شرارت پر بہت خوش تھے۔ مگر بدقسمتی ہماری کہ جن ڈاکٹر صاحب کو ہم نے سب سے پہلے دھمکی دی تھی۔ ان کو پہلے بھی اسی طرح کی دھمکیاں مل چکی تھیں۔ اسی لیے انھوں نے اپنے فون پر آبزرویشن لگوائی ہوئی تھی۔ عجیب اتفاق یہ کہ انھیں اپنے مریض اشفاق صاحب کے متعلق ہی دھمکیاں مل رہی تھیں۔ بس پھر ہمارے فون کا نمبر فوراً معلوم کر لیا گیا اور پھر اس نمبر کی مدد سے ہمارے گھر کا پتا بھی معلوم کر لیا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد ایک انسپکٹر صاحب اپنے دو عدد سپاہیوں کے ساتھ ہمارے گھر موجود تھے۔

پاپا چوں کہ لاہور سے آ چکے تھے اس لیے انسپکٹر صاحب سے ان کی ملاقات ہو گئی۔ انسپکٹر صاحب کی پوری بات سننے کے بعد پاپا نے ان سے کہا کہ اول تو میری کسی سے دشمنی نہیں اور دوسرا یہ کہ میں تو کسی کام سے اپنی اہلیہ کے ہمراہ لاہور گیا تھا اور میرے دونوں بیٹے ہی گھر پر تھے۔ مگر انسپکٹر صاحب نے ابو کو وہ ریکارڈ شدہ ٹیپ سنوائی تو ابو پہچان گئے کہ یہ ہماری آواز ہے۔ ابو نے ہمیں بلایا۔ اور ٹیپ سنوائی پھر انتہائی سخت لہجے میں ہم سے اصل بات پوچھی۔ ہم تو پہلے ہی گھبرائے ہوئے تھے۔ فوراً رونے لگے اور ساتھ ہی پاپا کو بتا دیا کہ ہم نے تو صرف مذاق کیا تھا۔ پاپا نے انسپکٹر صاحب کو کافی دیر لگا کر مطمئن کر کے بھیجا اور پھر اندر آ کر ہماری خوب خبر لی۔ (پانچواں انعام: 60 روپے کی کتابیں)

اچھے بچے

رقیہ صابر، شاہ کوٹ

"ہائے میں مر گئی، ہائے امی جی، ہائے میں مر گئی"۔ بجلی کے جھٹکے کی وجہ سے اس سے صحیح طریقے سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ اس کی بڑی بہن گڑیا کی ہنسی نکل گئی۔

ہوا یوں کہ ان کی امی صحن میں برتن صاف کر رہی تھیں۔ انھوں نے اپنی دونوں بیٹیوں سے کمرے میں بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ کمرے میں بیٹھ تو گئیں مگر اچانک ان کی آپس میں اس بات پر بحث شروع ہو گئی کہ بند پنکھے میں بجلی ہوتی ہے یا نہیں۔ گڑیا نے کہا کہ پنکھے میں بجلی ہوتی ہے۔ مگر چندہ نہ مانی۔ بحث میں جیتنے کی غرض سے ثبوت کے طور پر اس نے بند پنکھے کے تار کو ہاتھ میں پکڑ لیا اور کہنے لگی "یہ دیکھو مجھے کچھ نہیں ہوا"

"ابھی تمھیں کو مزہ آ جائے گا" گڑیا نے کہا۔

"کیا مزہ آئے گا" چندہ غرور کے ساتھ بولی۔

"گڑیا نے کہا" تم تار کو ذرا اوپر سے پکڑ دیکھو"۔

چندہ نے تار کو ذرا اوپر سے پکڑا ہی تھا کہ اس کو ایک جھٹکا سا لگا اور "ہائے میں مر گئی۔ ہائے امی جی" وہ چلانے لگی۔ مگر آواز اس کے حلق میں ہی رہ گئی۔

ان کی امی صحن سے دوڑی آئیں "کیا ہوا ہے میری بیٹی کو" امی نے آتے ہی پوچھا۔ اور تار کو جلدی سے سوئچ بورڈ سے نکال دیا۔ چندہ نیچے گر گئی۔ امی نے پھر پوچھا "کیا ہوا تھا؟"

اس پر گڑیا نے بمشکل اپنی ہنسی روک کر امی کو پوری داستان سنائی۔ امی چندہ کا ہاتھ سہلانے لگیں اور گڑیا سے کہا کہ وہ دودھ کا گلاس لے کر آئے۔

"بیٹی، آپ نے اپنی بڑی بہن کے کہنے کے باوجود احتیاط نہ کی" امی نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "میری بیٹی زندگی میں کامیاب ہونا ہے تو ہمیشہ بڑوں کا کہنا مانو۔ اسی میں کامیابی کا راز پوشیدہ ہے۔ کیوں کہ بڑے ہمیشہ اپنے علم اور تجربہ کی بنیاد پر بات کرتے ہیں۔ اس لیے ہمیں اس پر عمل کرنا چاہیے"۔

چندہ نے کہا "امی جان آپ مجھے معاف کر دیں میں آج سے ہمیشہ بڑوں کا کہنا مانوں گی"۔

"شاباش بیٹی، اچھے بچے وہی ہوتے ہیں جو اپنا قصور مان لیتے ہیں" امی نے یہ کہا اور صحن میں چلی گئیں۔ (چھٹا انعام: 50 روپے کی کتابیں)

شرارتی لکیریں

شاہد
ریاض
شاہد

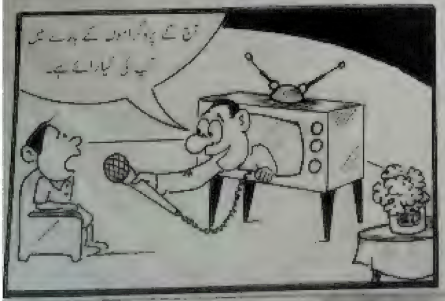

ہونہار مصور

میرا پیارا وطن

1 محمد نعیم، ساہی وال (پہلا انعام 100 روپے کی کتابیں)

2 (دوسرا انعام 75 روپے کی کتابیں)

3 صبا تبسم، کراچی (تیسرا انعام 50 روپے کی کتابیں)

4 (چوتھا انعام 45 روپے کی کتابیں)

5 حمیدہ جان، راول پنڈی (پانچواں انعام 40 روپے کی کتابیں)

6 رن اسلم، بہاول پور (چھٹا انعام 35 روپے کی کتابیں)

ان ہونہار مصوروں کی تصویریں بھی اچھی تھیں: طارق علی چیمہ، گوجرانوالہ۔ حذیفہ مظفر رحیم یار خان۔ ماریہ شاہد، ملتان۔ ثمرہ ارشد، جہلم۔ واصف خان، ٹیکسلا۔ جویریہ طوبیٰ، کراچی۔ ابیحہ طیب، سیال کوٹ چھاؤنی۔ جویریہ بتول، کراچی۔ عمیر خالد چوہدری، لاہور۔ شفق خورشید، بھٹی راہ چھاؤنی۔ محمد نعمان بشیر، فیصل آباد۔ حزل حسین، اکل روڈ۔ شگفتہ مریم، سیال کوٹ۔ عبداللہ زبیر، لاہور۔ توکل اقبال، تاندلیانوالہ۔ محسن علی، وزاغ جلال پور جٹاں۔ وقار عظیم، ساہی وال۔ سعد علی ملک، راول پنڈی۔ کرن اسلم، بہاول پور۔ رضوان علی شاہ، جھنگ صدر۔ صہیب ناصر، میرپور خاص۔ رابعہ خاندیب، حیدرآباد۔ فطرت گل، لاہور۔ عطیہ جاوید، راناچنیوٹ۔ غلام مصطفیٰ عابد، چورنڈ۔ سعدیہ کنول، نجوال چھاؤنی۔ حمزہ منصور، لاہور۔ محمد عثمان مرزا، فیصل آباد۔ سارا ابواسامہ، محمد تمار، ملتان۔ محمد مسعود علی، نجوال چھاؤنی۔ صدف گل، شیخ کراچی۔ محمد عدیل ظفر، لاہور۔ عماد انور، لاہور۔ نائلہ فخرین، راول پنڈی۔ ایمان ریاض، کالا گجراں۔ محمد یاسر، راول پنڈی۔

آخری تاریخ 7 اگست

آخری تاریخ 7 ستمبر

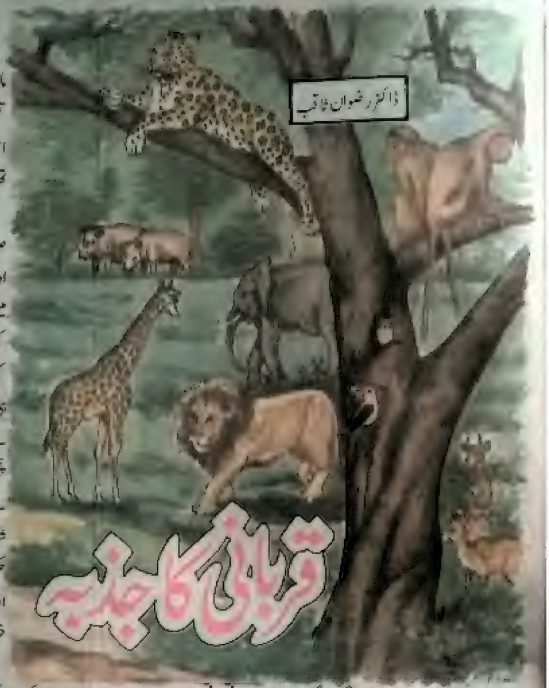

قربانی کا جذبہ

ڈاکٹر رضوان ثاقب

یہ ایک وسیع و عریض گھنا جنگل تھا جس میں قسم قسم کے جانور پائے جاتے تھے۔ سب جانور آزادی سے گھومتے' جنگل کے پھل کھاتے' آکسیجن سے پر کھلی اور صاف ہوا کے مزے اڑاتے' اپنی نیند سوتے اور اپنی نیند جاگتے تھے۔ مگر پھر اچانک ایک ایسا واقعہ ہوا کہ جنگل کی یہ پر سکون فضا تباہ و برباد ہونے لگی۔ ہر طرف خوف و ہراس کا عالم پیدا ہو گیا۔ جنگل کے بادشاہ سمیت سب جانور سارا سارا دن اپنی رہائش گاہوں میں دبکے بیٹھے رہتے۔ جب بھوک بہت زیادہ ستاتی تو ڈرتے ڈرتے خوراک کی تلاش میں نکلتے اور پھر ان میں سے کچھ پیٹ کی آگ بجھا کر واپس آجاتے اور چند ایک کسی طرف سے آنے والی گولی کا شکار ہو کر وہیں ڈھیر ہو جاتے۔

جنگل کا یہ موجودہ ماحول ہر جانور کے لیے بڑا تکلیف دہ تھا مگر ان کے پاس اس کا کوئی حل موجود نہیں تھا۔

دراصل ہوا یہ کہ کئی صدیوں سے یہ جنگل آباد تھا اور اس کے اڑوس پڑوس میں بسنے والی کسی انسانی بستی کو نہ تو کسی جانور نے کبھی کوئی نقصان پہنچایا تھا اور نہ ہی ان بستیوں کے انسانوں نے کبھی جنگل کا رخ کیا تھا۔ پچھلے سال انہی دنوں کی بات ہے کہ کسی دوسرے ملک کی شکار پارٹی نے اس ملک کی حکومت سے شکار کھیلنے کی اجازت مانگی' جس میں یہ خوب صورت جنگل بھی تھا۔

حکومت نے نہ صرف اس کا اجازت نامہ جاری کرنے کی اس شکار پارٹی سے بھاری رقم وصول کی بلکہ ساتھ یہ شرط بھی عائد کی کہ ہمارے دو وزیروں کو بھی ماہر شکاری بنایا جائے۔ شکار پارٹی نے حکومت کی یہ دونوں شرطیں مان لیں اور پھر اگلے ہی مہینے وہ اپنی رائفلیں' چاقو' چھریاں' نیزے' بلم اور بھالے لے کر اس ملک میں آن پہنچے جہاں یہ پر سکون جنگل آباد تھا۔ شکار کی تربیت حاصل کرنے کے لیے اس ملک کے دو وزیر بھی شکاری ہتھیاروں سے لیس ہو کر اس شکار پارٹی کے ساتھ ہو لیے اور پھر یہیں سے اس جنگل کی بربادی کی داستان شروع ہو گئی۔

جنگل میں داخل ہوتے ہوئے ایک وزیر نے شکار پارٹی سے پوچھا "آپ نے اس سے پہلے کہاں کہاں شکار کھیلا ہے؟"

"ایشیا' بھارت' پاکستان' جنوبی افریقہ' شمالی افریقہ اور فی دوسرے ملکوں میں" شکار پارٹی میں سے ایک فرد نے جواب دیا تو جنگل کے جانوروں میں سے جیسے کسی نے سانس روک لیا۔

"کس کس جانور کو شکار کرنے میں کام یاب ہوئے؟" دوسرے وزیر نے پوچھا۔

"چرندوں' پرندوں' درندوں' غرض سبھی جانوروں کو شکار کیا ہے۔ ہو جانور ہماری بندوق کی نال کے سامنے آجاتا ہے پھر اس کی جان کبھی اس کے جسم کے ساتھ نہیں رہتی"۔

شکار پارٹی کی طرف سے ایک فرد کا یہ جواب سنتے ہی جھاڑیوں میں چھپے ہوئے ایک گیدڑ کی مارے خوف کے ہوک نکل گئی۔ "ٹھاہ"..... اس کے ساتھ ہی گولی چلنے کی آواز آئی۔ گیدڑ پہلا جانور تھا جو اس شکار پارٹی کی گولی کا نشانہ بنا تھا۔ اس ناگہانی موت پر چرندوں پرندوں اور درندوں سبھی جانوروں نے احتجاج کیا۔ چڑیوں' کوؤں اور دوسرے بے شمار پرندوں نے تو گیدڑ کی لاش کے اوپر اس طرح جم گھٹا بنا دیا کہ شکاریوں کو حیران ہو کر اوپر آسمان کی طرف دیکھنا پڑا کہ یہ اندھیرا سا کیوں ہے۔ انہیں آسمان پر بے شمار پرندے ایک سائبان کی طرح ہوا میں تیرتے نظر آئے۔ دونوں وزیروں کے چہروں پر گھبراہٹ کے آثار نمودار ہوئے۔ شکار پارٹی نے ان کی گھبراہٹ کو دور کرنے کے لیے اپنی رائفلوں کا رخ آسمان کی طرف کیا اور بغیر کسی انتظار کے یکے بعد دیگرے کئی گولیاں چلا دیں۔ دو کوے' ایک فاختہ اور تین چڑیاں ان گولیوں کا نشانہ بن گئیں۔ اس واقعہ نے جانوروں پر یہ ثابت کر دیا تھا کہ ان سے احتجاج کا حق بھی چھین لیا گیا ہے۔ اس کے فوراً بعد تمام جانور غائب ہو گئے۔ سارے جنگل میں سناٹا چھا گیا۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ پہلے تو ہوا کے چلنے سے پتوں کی سرسراہٹ کی آوازیں آتی تھیں مگر اب ہوا بھی رک گئی تھی۔ اس لیے معمول سرسراہٹ کی آواز بھی نہیں آرہی تھی۔ شیر تو شیر چیونٹیوں تک نے اپنے اپنے بلوں میں پناہ لے لی تھی۔ وزیر قیامت کی اس خاموشی کے منظر کو دیکھ کر ایک بار پھر گھبرا گئے مگر اس گھبراہٹ کو دور کرنا اب اس شکار پارٹی کے بس میں بھی نہیں تھا۔ بہرحال وہ سب جنگل میں چلتے رہے اور اپنے ہی قدموں کی چاپوں سے ڈرتے رہے۔ کئی گھنٹے جنگل میں گھومتے پھرنے کے باوجود انہیں کوئی جانور نظر نہ آیا۔ کچھ دیر کھات لگا کر بیٹھے رہے۔ چوں کہ جنگل میں انسان کے ہاتھوں کسی جانور کی ہلاکت کا یہ پہلا واقعہ تھا اس لیے کوئی بھی جانور اتنی جلدی اپنی رہائش گاہ سے باہر نکلنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ آخر کار انہیں ناکام لوٹنا پڑا۔

اس واقعہ کے بعد جنگل میں بڑی بے چینی پائی گئی۔ ہر جانور اس شکار پارٹی کو کوس رہا تھا مگر کسی کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ یہ شکار پارٹی کل بھی آئے گی۔ اگلے دن صبح 10 بجے کے قریب یہ پارٹی دوبارہ جنگل میں داخل ہوئی۔ اب ان کے ساتھ دو کے بجائے ایک وزیر تھا۔

"یار' وہ تمہارے ساتھی کو کل رات کیا ہوا تھا؟" شکار پارٹی میں سے ایک آدمی نے وزیر سے پوچھا۔

"وہ جنگل کے ماحول سے خوف زدہ ہو گیا تھا۔ اب سرکاری ہسپتال میں داخل ہے۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اس کا ذہنی توازن تو ٹھیک ہو جائے گا مگر ہم اس کے خواب میں ڈر جانے کا علاج نہیں کر سکیں گے" وزیر نے افسردگی کے ساتھ جواب دیا۔

جنگل کے جانوروں نے یہ بات سنی مگر انہیں اس کی خوشی نہ ہوئی۔ کیوں کہ انہیں تو اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ ایک ہرن چوکڑیاں بھرتا شکار پارٹی کے پاس سے اس قدر تیزی سے گزرا کہ انہیں بندوق کی نال اس کی طرف سیدھی کرنے کا موقع بھی نہ ملا۔ اب شکار پارٹی نے بالکل خاموشی اختیار کر لی اور وہ دبے پاؤں جنگل میں چل رہے تھے۔ کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ یہ ہرن ان کی آواز سن کر بھاگا ہے۔ اور یہ بات تھی بھی ٹھیک۔ اگر وہ باتیں نہ کر رہے ہوتے تو شاید ہرن کو ان کی موجودگی کا علم نہ ہوتا اور وہ بے چارا مفت میں مارا جاتا۔ اس بات کا ثبوت جنگل کے جانوروں کو تھوڑی ہی دیر بعد مل بھی گیا۔ وہ اس طرح کہ ایک نیل

گئے اپنی موج میں رمھا رہی تھی کہ شکار پارٹی نے اس کی آواز سن کر اس کے تعاقب میں چلنا شروع کر دیا۔ پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ بے چاری نیل گائے کو اس وقت علم ہوا جب شکار پارٹی بالکل اس کے سر پر پہنچ گئی۔ فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی اور بے چاری گائے وہیں ڈھیر ہو گئی۔ سوائے اس کے خون کے فوارے کی طرح ابل پڑنے کے جنگل کی کسی چیز نے اس ہلاکت پر احتجاج نہ کیا۔ البتہ جنگل کا ہر جانور پریشان اور افسردہ تھا۔ ایک بھینس جو صبح سے بلاوجہ ڈکرا رہی تھی فائر کی آواز سن کر وہ بھی خاموش ہو گئی۔ ہاتھی چنگھاڑنے کے بجائے اپنے بیوی بچوں سمیت جنگل کے ایک کونے میں موجود ہاتھی گھاس میں جا چھپا۔ ایک بھینس بے چاری کو جب چھینک آئی تو وہ بھی اس شکاری پارٹی کے ظلم کا نشانہ بن گئی۔ جنگل کا بادشاہ جو کبھی جنگل میں گشت کرتا تھا تو سب جانور تنظیم کے لیے راستے سے ہٹ جاتے تھے' اب بے چارا اپنی کچھار میں نہایت غم گین بیٹھا تھا۔ اس کی بے بسی کا یہ عالم تھا کہ دھاڑنا تو درکنار وہ سانس بھی آہستہ لے رہا تھا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ شکار پارٹی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے

لیے ذہن میں مختلف ترکیبیں بھی سوچ رہا تھا۔

جنگل میں رات جلدی ہو جاتی ہے۔ سورج غروب ہونے میں کوئی ایک گھنٹا باقی تھا کہ شکار پارٹی کے ساتھ آئے ہوئے وزیر نے واویلا مچانا شروع کر دیا کہ رات ہو رہی ہے لہٰذا واپس جانا چاہیے۔ شکاریوں نے پہلے تو اسے سمجھانے بجھانے کی کوشش کی مگر پھر یہ سوچ کر اس کی بات مان لی کہ کہیں اس بے چارے کی بھی مارے خوف کے پہلے وزیر جیسی حالت نہ ہو جائے۔ شکاریوں کے جنگل سے چلے جانے کے بعد شیر اپنی کچھار سے نکلا اور بڑے ٹیلے پر چڑھ کر مخصوص انداز میں تین دفعہ دھاڑا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جنگل میں اب کسی قسم کا خطرہ نہیں نیز یہ کہ سب جانوروں کو بادشاہ سلامت نے اپنی رہائش گاہ پر بلایا ہے۔

جانور بے چارے تو پہلے ہی اس بات کے انتظار میں تھے کہ انہیں دو دنوں سے جنگل میں نازل ہونے والی اس آفت سے بچنے کی کوئی ترکیب بتائی جائے۔ لہٰذا سب جانور بادشاہ سلامت کی رہائش گاہ کے سامنے جمع ہو گئے۔

شیر نے جب جانوروں سے جنگل کے اس خونی منظر کے واقعات سنے تو خود اس کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ کسی کی بہن' کسی کا بھائی' کسی کا بیٹا' کسی کی ماں اور کسی کا باپ ان شکاریوں کی گولی کا نشانہ بن چکا تھا اور ابھی یہ سلسلہ رکا نہیں تھا' نیز کچھ علم نہیں تھا کہ یہ کب تک جاری رہے گا۔

"بادشاہ سلامت' اگر آج ہم نے اس کا کوئی حل نہ نکالا اور سب اپنی اپنی جگہ سہمے بیٹھے رہے تو شکار پارٹی ہمیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہلاک کرتی چلی جائے گی اور پھر وہ دن دور نہیں جب جنگل سے جانوروں کا نام نشان مٹ جائے گا" خرگوش نے کہا۔

"عالی جاہ! کوئی ترکیب ہمیں ضرور نکالنی چاہیے ورنہ آج ان بے چاروں کے بہن بھائی ان سے بچھڑے ہیں تو کل ہماری باری بھی آ سکتی ہے" ایک بوڑھے بندر نے سسکتے روتے جانوروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میرے خیال میں تو ہمیں اس جنگل کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ ہجرت کر لینا چاہیے" لیڈر نے مشورہ دیا۔

"یہ کسی صورت نہیں ہو سکتا' جب تک ہمارے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی ہے ہم اپنے پیارے جنگل کو ہرگز ہرگز نہیں چھوڑیں گے۔ اس کے ساتھ ہمارا صدیوں پرانا رشتہ ہے۔ اس نے ہمیں کھانے کو پھل دیے۔ بارش' دھوپ اور طوفان سے بچنے کا سامان کیا۔ آج بھی اس کی جھاڑیوں پتوں اور تنوں میں چھپ کر ہم سکون محسوس کرتے ہیں' کیا اب ہم اسے یونہی آرام سے چھوڑ دیں؟" ایک بھوری بلی نے قدرے جذباتی انداز میں کہا۔

"تو پھر کیا ہونا چاہیے؟" بادشاہ سلامت نے گہری تشویش کے ساتھ کہا۔

"بادشاہ سلامت' میں ایک ترکیب بتاتا ہوں۔ اس ترکیب کے ذریعے سب جانوروں کو ان ظالم شکاریوں سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا حاصل ہو سکتا ہے۔ مگر ایک بات ہے..." ایک بوڑھا بن مانس صرف اتنا کہ کر خاموش ہو گیا۔

"وہ کیا' وہ کیا" ہر طرف سے جانوروں نے بولنا شروع کر دیا۔

"مگر میری اس ترکیب پر عمل کرنے کے لیے دو ایسے جانوروں کو جو جنگل میں سب سے خوب صورت اور سب سے صحت مند ہوں قربانی دینا ہو گی" بن مانس نے گہری سوچ کے ساتھ کہا۔

"منظور ہے' میں قربانی کے لیے تیار ہوں' میرا بیٹا حاضر ہے' میں اور میرا دوست اس عظیم مقصد کے لیے حاضر ہیں' مجھے اور میرے بھائی کو اس قربانی کے لیے قبول فرمائیں" جانوروں کے اس بہت بڑے مجمعے میں سے مختلف آوازیں آنے لگیں۔

"بھائیو! پہلے بن مانس انکل کی ترکیب تو سن لو پھر اس بات کا بھی فیصلہ کر لیں گے کہ کس کس کو اس مقصد کے لیے قربان ہونا ہو گا" شیر بولا۔

سب جانور خاموش ہو گئے تو بن مانس یوں گویا ہوا "مجھے اس بات پر بڑی خوشی ہوئی ہے کہ ہم سب اپنی جنگلی قوم کے تحفظ اور دفاع کے لیے کٹ مرنے کے لیے تیار ہیں۔ میری ترکیب یہ ہے کہ کل صبح ہم سب جانور جنگل میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر قطاروں میں گھات لگا کر بیٹھ جائیں اور دو خوب صورت اور نوجوان جانور شکاریوں کو اپنے پیچھے لگا کر دوڑاتے ہوئے ادھر لے آئیں۔ شکاری یقیناً خوب صورت جانور دیکھ کر انہیں جان سے مارنے کے بجائے پکڑنے کی کوشش کریں گے۔ وہ ان کا دور تک تعاقب کریں گے۔ جب وہ وہاں پہنچیں گے جہاں ہم سب جانور گھات لگائے بیٹھے ہوں گے تو پھر ہم سب یک دم اس شکار پارٹی پر چاروں طرف سے حملہ آور ہو جائیں گے"۔

بن مانس کی یہ ترکیب سب جانوروں کو بہت پسند آئی۔

"مگر اس کے لیے کون سے دو جانور منتخب کیے جائیں گے؟" اژیال نے پوچھا۔ کیوں کہ اژیال کو اپنی خوب صورتی پر بڑا ناز تھا اور اس کی خواہش تھی کہ اسے ہی اس عظیم مقصد کے لیے منتخب کر لیا جائے۔

"ظاہر ہے جو جانور زیادہ تیز دوڑ سکتا ہے' اسے ہی منتخب کیا جائے گا" ریچھ نے قدرے مایوسی کے ساتھ کہا۔

"صرف دوڑ ہی نہیں' خوب صورتی بھی تو دیکھی جائے گی" زیبرے نے کہا۔

"آپ سب جانور خاموش ہوں' میں بتاتا ہوں" شیر نے کہا اور سب جانور ایسے خاموش ہو گئے پھر بادشاہ سلامت نے کہا۔

"ہرن جنگل کا سب سے خوب صورت جانور بھی ہے اور دوڑ میں بھی اس کا کوئی ثانی نہیں"۔

سب نے "واہ واہ! سبحان اللہ!" کہا اور پھر اس کے بعد دو خوب صورت جوان ہرن اس مقصد کے لیے چن لیے گئے۔ وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ اگلے دن صبح جب شکار پارٹی آئی تو سب جانور ایک جگہ گھات لگا کر بیٹھ گئے اور منصوبے کے مطابق دونوں ہرن ایسی جگہ پر گھومنے لگے جہاں سے وہ جنگل میں داخل ہونے والے ہر فرد کو آسانی سے نظر آ سکیں۔

کوئی صبح دس ساڑھے دس بجے کا وقت ہو گا کہ شکار

ہرنی ایک وزیر کے ساتھ جنگل میں داخل ہوئی۔ ہرنوں نے انھیں دیکھتے ہی اپنی اپنی ناک سے کھوں کھوں کی آواز نکالی اور چوکڑیاں بھرتے ہوئے ادھر ادھر بھاگنے لگے۔

"واہ کیا خوب صورت ہرن ہیں" شکار پارٹی میں سے ایک نے کہا۔

"میں ان کا نشانہ لوں" وزیر صاحب نے بے قرار ہوتے ہوئے کہا۔

"نہیں ایسے ہرنوں کو مار گرانے کے بجائے پکڑنا چاہیے۔ ہم انھیں منہ مانگی قیمت پر فروخت کر سکتے ہیں"۔ شکار پارٹی میں سے سب سے سیانے آدمی نے کہا۔ پھر وہ ان ہرنوں کو گھیرے میں لینے کے لیے ان کے پیچھے دوڑ پڑے۔ ہرن ان شکاریوں کو بھگاتے ہوئے اس طرف لے آئے جہاں سب جانور آمنے سامنے دو قطاروں میں گھات لگائے بیٹھے تھے۔ منصوبے کے مطابق عین اس وقت جب شکاری ان

گھات والی دونوں قطاروں کے درمیان میں آگئے تو شیر اپنی مخصوص آواز میں دھاڑا۔ سب جانور اس آواز کو سنتے ہی باہر نکل آئے اور اس شکاری پارٹی پر جھپٹ پڑے۔ وزیر نے بوکھلا کر گولی چلا دی جو ان دونوں ہرنوں میں سے ایک کے سینے میں لگی۔ وہ زمین پر گرا اور پھر دوبارہ اٹھ نہ سکا۔

جب کہ اس کے ساتھ ہی چیتے نے اس وزیر پر ایسا جھپٹا مارا کہ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ شکار پارٹی پر جانور اس طرح پل پڑے تھے کہ ان میں سے کسی کو خبر نہیں تھی کہ اس کی رائفل کہاں ہے۔ وہ صرف اپنے ہتھیار ہی نہیں بلکہ بھاگتے ہوئے اپنے جسم کے کئی اعضا بھی گنوا بیٹھے تھے۔ لومڑی کے ہاتھ میں ایک انسانی کان تھا۔ ایک عقاب نے اپنی چونچ میں ان میں سے کسی شکاری کی آنکھ پکڑی ہوئی تھی۔ بھیڑیے نے کسی شکاری کی گردن سے بوٹی نوچ لی تھی۔ غرض ہر جانور نے اپنی ہمت اور بساط سے بڑھ کر جواں مردی اور بہادری کے جوہر دکھائے تھے۔ وہ دن اور آج کا دن کبھی کسی شکار پارٹی نے نہ تو اس جنگل کا رخ کیا ہے اور نہ ہی اس ملک کی حکومت نے اب کبھی کسی شکار پارٹی کو ادھر آنے کی اجازت دی ہے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ اب جنگل کے ان شریف جانوروں سے اس ملک کی حکومت بھی اس قدر خوف زدہ تھی کہ وہ اپنے وزیر کی لاش اٹھانے بھی جنگل میں نہ آئی۔ جب کہ جنگل کے تمام جانوروں نے اس لاش کو احتجاجاً کھانے سے بھی انکار کر دیا۔

بادشاہ سلامت نے جنگل کے عین درمیان میں وزیر کے ہاتھوں جاں بحق ہونے والے ہرن کی ایک یادگار بنانے کا اعلان کیا جس میں سب جانوروں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جب کہ شکاریوں کے ہاتھوں بچ جانے والے ہرن کو جنگل کے سب سے بڑے تمغے سے نوازا گیا۔ ایک ہرن کی شان دار یادگار اور دوسرے ہرن کے گلے میں موجود جنگل کا سب سے بڑا اعزاز اس بات کی علامت ہیں کہ جو قوم اپنے اندر قربانی کا جذبہ رکھتی ہے وہی آزاد فضاؤں میں سانس لینے کی حق دار ہوتی ہے۔

سرورق اچھا تھا۔ کہانیوں میں نتاشاہ اور بھورا بھالو 'گولی کا جواب' ایک عظیم بہن زبردست تھیں۔ نظمیں بھی بہت اچھی تھیں۔ کھیلوں کی دنیا میں عالمی کرکٹ کپ چٹکے دار معلومات واقعی مزے دار تھیں۔ دل چسپ اور ناقابل یقین بھی اچھا سلسلہ ہے (عثمان اسلم فیصل آباد)

اس ماہ کا شمارہ بھی ہمیشہ کی طرح بہت خوب صورت، اچھا اور دل چسپ تھا۔ کہانیوں میں بچی کہانی 'احساس' 'دو زندوں کا تذکرہ' اور 'ایک عظیم بہن' بہت ہی اچھی تھیں۔ دماغ لڑاؤ میں اگر خالی جگہ کے بجائے سوالات پوچھے جائیں تو اس سے معلومات میں اضافہ ہو (حافظ محمد اشفاق جوہر آباد)

ٹائٹل دیکھ کر بہت ہنسی آئی۔ کیوں کہ الو کی ایک آنکھ بند تھی۔ پہاڑوں کا منظر دل کو بھا گیا۔ ملا نصرالدین کا واقعہ پڑھ کر بہت ہنسی آئی۔ مجرم کون؟ سلسلہ اچھا جا رہا ہے (راجا محمد رضوان خوشاب)

نتاشا اور بھورا بھالو تھی تو ننھے منوں کے لیے لیکن مجھے بھی بہت پسند آئی۔ احساس ایک سبق آموز کہانی تھی۔ ہمارے خیال میں لڑکیوں کے لیے قسم قسم کے پکوان تیار کرنے کا سلسلہ زیادہ بہتر ہے (ثمرین لطیف لاہور)

آپ لڑکیوں کے لیے پکوان تیار کرنے کا سلسلہ شروع کریں۔ کیوں کہ سلائی کڑھائی تحریری طور پر سمجھ میں نہیں آتی (عائشہ افتخار لاہور)

ایک مینڈک ایک الو کی آخری قسط بہت پسند آئی۔ ڈاکٹر رضوان ثاقب کی تحریر ایک عظیم بہن بہت اچھی تھی (حفصہ الیاس گجرات)

نجمہ معراج اور نظر زیدی صاحب کی کہانیاں نصیحتوں کا پلندہ ہوتی ہیں۔ کارٹون کہانی 'دل چسپ کھیل بغیر خرچ کے' 'آیئے دوست بنائیں' ہونہار مصور اور بلاعنوان کارٹون ختم کر دیں (عادل خان ٹوپی)

اس ماہ کا ٹائٹل بہت خوب صورت تھا۔ کہانیوں میں ایک عظیم بہن' احساس اور مزدور بادشاہ بہت اچھی لگیں۔ شرارتی لکیریں' ملا نصرالدین اور لطائف بہت ہی مزے کے تھے (رابعہ ارشد فیصل آباد)

تعلیم و تربیت کو بچپن میں میری امی پڑھتی تھیں اور اب یہ ہمارا محبوب ترین رسالہ ہے۔ ہمیں اس کا ہر سلسلہ پسند ہے (صدف ناز، مصباح جبین (ایرہ اسماعیل خان)

تعلیم و تربیت اپنی مثال آپ ہیں۔ ایک مینڈک ایک الو کا اختتام بہت عمدہ ہوا۔ جو کہانیاں زیادہ پسند آئیں ان میں گولی کا جواب' دو زندوں کا تذکرہ' ایک عظیم بہن تھیں (ایم ابوبکر صدیق فیروزکے)

سرورق بہت اچھا تھا۔ کہانیوں میں مزدور بادشاہ' گولی کا جواب اور دو زندوں کا تذکرہ بہت پسند آئیں (اقصیٰ شوکت جہلم چھاؤنی)

سرورق بہت اچھا تھا۔ گولی کا جواب اور کارٹون کہانی بہت پسند آئیں۔ شعیب اختر کا انٹرویو اور ریکارڈ شائع کریں (محمد بلال خالد حفظ لاہور)

سرورق بہت پسند آیا۔ نظموں میں بیو ٹی کا گیت بہت اچھا تھا اور کہانیوں میں نتاشا اور بھورا بھالو' ایک مینڈک ایک الو' گولی کا جواب' احساس' دو زندوں کا تذکرہ اور مزدور بادشاہ بازی لے گئیں۔ کھیلوں کی دنیا میں انضمام الحق کا انٹرویو شائع کریں (سیدہ کنیز سمیرا کاہنہ نو)

کہانیاں سب ہی اچھی تھیں مگر ایک مینڈک ایک الو' نتاشا اور بھورا بھالو اور مزدور بادشاہ زیادہ پسند آئیں۔ لڑکیوں کے لیے قسم قسم کے پکوان اور مفید ٹوٹکوں کا سلسلہ شروع کرنا چاہیے (رابعہ سجاد لاہور چھاؤنی)

کہانیاں گولی کا جواب' ایک عظیم بہن' مزدور بادشاہ اور نیک دل ڈاکو بہت پسند آئیں۔ نظمیں اور لطائف بھی اچھے تھے۔ کھیلوں کی دنیا بھی بہت اچھا تھا (عبیداللہ انور دوبازی)

کہانیوں میں ایک مینڈک ایک الو' گولی کا جواب اور مزدور بادشاہ بہت پسند آئیں۔ لڑکیوں کے لیے سلائی کڑھائی کے نئے نمونے بنانے اور پکوان تیار کرنے کا سلسلہ شروع کرنے کا خیال بہت اچھا ہے (نادیہ انوار گوجرہ)

سرورق اچھا تھا۔ یہ کہانیاں نمبر لے گئیں: بچی کہانی' زیرو زیرو فائیو' ایک عظیم بہن اور دو زندوں کا تذکرہ (وقار خالد راناساہی والا)

تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ نجمہ معراج صاحب کی کہانی دو زندوں کا تذکرہ اور سلیم خان گمی صاحب کی کہانی مزدور بادشاہ بہت پسند آئیں۔ شعیب اختر اور شاہد آفریدی کا انٹرویو ضرور شائع کریں (شعیب منور تحصیل منور)

کہانیوں میں نتاشا اور بھورا بھالو' نیک دل ڈاکو' ایک مینڈک ایک الو کی آخری قسط' گولی کا جواب' احساس' دو زندوں کا تذکرہ اور مزدور بادشاہ پسند آئیں۔ ہمارے پیارے اوپنر سعید انور کے ریکارڈز اور انٹرویو ضرور شائع کریں (اسامہ حبیب کوٹ مومن)

کہانیاں نیک دل ڈاکو' ایک عظیم بہن' زیرو زیرو فائیو' احساس' مزدور بادشاہ اور گولی کا جواب بہت پسند آئیں (محسن الحق لاہور)

سرورق بہت خوب صورت تھا۔ اداریے میں اچھی اچھی باتیں تھیں۔ ہم باری باری ساری کہانیاں پڑھ ڈالیں۔ سب کی سب نہایت مزے دار تھیں۔ ابوالنور شعوان ثاقب کی کہانی ایک عظیم بہن سب پر سبقت لے گئی۔ مجرم کون؟ نہایت آسان تھا۔ (سائرہ الطاف، صائمہ الطاف، لاہور)

سرورق ہمیشہ کی طرح بہت پسند آیا اور ایک مینڈک ایک الو کی آخری قسط بہت ہی زیادہ پسند آئی۔ اس مرتبہ جو کہانیاں اچھی رہیں وہ یہ ہیں: گولی کا جواب اور مزدور بادشاہ۔ (ماورا اشتیاق، لاہور)

جولائی کا رسالہ بہت خوب صورت تھا۔ سرورق بہت پسند آیا۔ کہانیوں میں احساس اور دو زندوں کا تذکرہ بہت پسند آئیں۔ کھیلوں کی دنیا میں شعیب اختر کے بارے میں ضرور لکھیں۔ (محمد حنیف، ساہی وال)

آپ نے ہماری رائے پوچھی ہے کہ لڑکیوں کے لیے قسم قسم کے پکوان تیار کرنے کا طریقہ ہو یا کڑھائی کے نئے نئے نمونے بنانے کا۔ میری رائے یہ ہے کہ قسم قسم کے پکوان تیار کرنے کی تراکیب بتانے کا سلسلہ شروع کریں۔ (سعدیہ اکرم، بہاول پور)

جن کہانیوں نے متاثر کیا وہ زیرو زیرو فائیو، دو زندوں کا تذکرہ، ایک عظیم بہن اور مزدور بادشاہ ہیں۔ (خاتون زارا اکرم، لاہور)

سرورق دیکھ کر یوں لگا جیسے ہم خود ان حسین وادیوں پر اڑتے جا رہے ہیں۔ ایک مینڈک ایک الو کا اختتام بہت اچھا لگا۔ ہمیں یقین ہے اب آپ کوئی بہانہ بنائے بغیر ناول شروع کر دیں گے۔ (کرن اسلم، بہاول پور)

کہانیاں گولی کا جواب اور دو زندوں کا تذکرہ نمبر ون تھیں۔ شاہد آفریدی اور راشد لطیف کا انٹرویو ضرور شائع کریں۔ (حافظ محمد اشرف، حاصل پور)

سرورق اچھا تھا۔ مزدور بادشاہ اور احساس کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ ایک مینڈک ایک الو کی تیسری قسط بھی اچھی تھی۔ رسالے کو ذرا مضبوطی سے پن لگایا کریں، ہمیں اکھڑا ہوا ملتا ہے۔ (ثمینہ ارشد، اسلام آباد)

ایک سال کے عرصے میں تعلیم و تربیت کا کوئی ایک خاص نمبر نہیں چھپا۔ امید تھی کہ مئی کا سالنامہ آئے گا مگر ایسا نہ ہوا۔ اگر اس سال کوئی خاص نمبر ہے تو ضرور بتائیں اور ہاں کھیلوں کی دنیا میں کرکٹ کے علاوہ بھی کسی کھیل کو جگہ دیں۔ (محمد مدثر حسن، جلال پور پیروالا)

کہانیوں میں ایک مینڈک ایک الو، تماشا اور بھورا بھالو، احساس، نیک دل ڈاکو، دو زندوں کا تذکرہ اور مزدور بادشاہ بہت پسند آئیں۔ نظموں میں چیونٹی کا گیت زبردست تھی۔ (حافظہ، گجرات)

کہانیوں میں مزدور بادشاہ، ایک عظیم بہن، ایک مینڈک ایک الو، زیرو زیرو فائیو اور دو زندوں کا تذکرہ پسند آئیں۔ میرے خیال میں لڑکیوں کے لیے قسم قسم کے پکوان تیار کرنے کا سلسلہ مناسب رہے گا۔ شعیب اختر اور شاہد آفریدی کا انٹرویو ضرور شائع کریں۔ (مہروز راجا، ملتان)

سرورق ہمیشہ کی طرح نہایت عمدہ تھا۔ کہانیوں میں نیک دل ڈاکو، گولی کا جواب، احساس اور ایک عظیم بہن، نظموں میں چیونٹی کا گیت اور ستارہ جہاں کا نمبرون رہیں۔ علمی آزمائش میں سوال و جواب کا سلسلہ شروع کریں۔ (محمد طاہر عمران، ڈیرہ اسماعیل خان)

کہانیاں نیک دل ڈاکو، گولی کا جواب، احساس اور دو زندوں کا تذکرہ بہت پسند آئیں۔ ایک مینڈک ایک الو بے حد دل چسپ کہانی ہے۔ چٹپٹے مسالے دار کا سلسلہ دوبارہ شروع کریں۔ (آمنہ حمید مغل، لاہور)

اس بار رسالہ بے مثال تھا۔ سرورق کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔ نیک دل ڈاکو، احساس اور گولی کا جواب کہانیاں بہت اچھی لگیں۔ ایک مینڈک ایک الو بھی اچھی تحریر تھی۔ شعیب اختر کا انٹرویو ضرور شائع کریں۔ (ذی شان احتشام النعمان، ڈیرہ اسماعیل خان)

جولائی کا ٹائٹل بہت اچھا لگا۔ کہانیوں میں گولی کا جواب، احساس اور دو زندوں کا تذکرہ زبردست تھیں۔ (حاجی محمد طاہر ابن امام، بہاول پور)

سرورق بہت زبردست تھا۔ تمام کہانیاں بہت پسند آئیں۔ خاص طور پر دو زندوں کا تذکرہ، مزدور بادشاہ، ایک عظیم بہن، زیرو زیرو فائیو اور احساس بہت پسند آئیں۔ مجرم کون؟ میں ذرا مشکل کیس دیا کریں اور رسالے کے صفحات بڑھا دیں۔ (عالیہ وقار، سرگودھا)

جولائی کے شمارے میں نیک دل ڈاکو، ایک عظیم بہن، احساس اور مزدور بادشاہ بہت اچھی تحریریں تھیں۔ (محمد علی وڑائچ، تجھورو)

کہانیوں میں گولی کا جواب، مزدور بادشاہ اور دو زندوں کا تذکرہ بہت پسند آئیں۔ سرورق بہت خوب صورت تھا۔ (نسیم شاہ، کوٹ)

سرورق پر دلوں کو خوش کر دینے والا منظر دیکھ کر دل چاہا کہ فوراً وہاں پہنچ جائیں لیکن چوہوں کی فوج اور پائلٹ مینڈک کو دیکھ کر فوراً ارادہ ترک کر دیا۔ کہانیاں گولی کا جواب اور نیک دل ڈاکو بہت پسند آئیں۔ اس کے علاوہ مستقل سلسلے بھی اپنی مثال آپ تھے۔ (شیخ محمد انیس، فیصل آباد)

سرورق ہمیشہ کی طرح نہایت اچھا تھا۔ گولی کا جواب، تماشا اور بھورا بھالو اور ایک مینڈک ایک الو بہت پسند آئیں۔ چیونٹیوں کا گیت بہت اچھا لگا۔ عالمی کرکٹ کپ چٹخارے دار معلومات پڑھ کر ہماری خوشی دوبالا ہو گئی۔ شعیب اختر اور ثقلین مشتاق کا انٹرویو ضرور شائع کریں۔ (جنید عائشہ سویرا)

لڑکیوں کے لیے سلسلے کے متعلق میری تجویز یہ ہے کہ گھر کی آرائش کے لیے مختلف چیزیں بنانے کی ترکیبیں یا پکوان بنانے کی ترکیبوں کا سلسلہ شروع کیا جائے جو کہ انعامی بھی ہو۔ (شاہ حفیظ، اسلام آباد)

آیئے دوست بنائیں

[illegible] 16 سال
[illegible]
[illegible]

[illegible] 16 سال
[illegible]
مکان نمبر 13/3 [illegible]
[illegible]

[illegible] 10 سال
[illegible]
[illegible]

[illegible] 13 سال
[illegible]
[illegible]

[illegible] 10 سال
[illegible]
56 [illegible] 2 [illegible]
[illegible]

[illegible] 16 سال
[illegible]
48/10 [illegible]
[illegible]

[illegible] ریحان 13 سال
[illegible]
Olsbeet Berge 21...
89?, Oslo, Norway

[illegible] صدیق 10 سال
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] 16 سال
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] 15 سال
[illegible]
مکان نمبر 167 گلی نمبر 2
[illegible]

[illegible] 9 سال
[illegible]
42 [illegible] 5 [illegible]
[illegible]

[illegible] صدیقی 16 سال
[illegible]
[illegible]
206/3 [illegible]

[illegible] 14 سال
[illegible]
[illegible] 6 [illegible]
[illegible]

[illegible] 10 سال
[illegible]
20 [illegible]
[illegible]

[illegible] 15 سال
[illegible]
گلی نمبر 12 [illegible]
[illegible]

[illegible] 10 سال
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] 16 سال
[illegible]
مکان نمبر 102 [illegible]
[illegible]

[illegible] 13 سال
[illegible]
15 [illegible]
[illegible]

[illegible] 17 سال
[illegible]
[illegible]
[illegible]

آصف [illegible] 16 سال
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] 16 سال
[illegible]
23 [illegible]
[illegible]

[illegible] 13 سال
[illegible]
[illegible]

آیئے دوست بنائیں کے لیے یہ کوپن پر کر کے اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔
(لڑکیاں اس میں حصہ نہیں لے سکتیں)

نام .... عمر ....

مشاغل ....

پتا ....

لسی

محمد طاہر ضیا طاہر

سوغاتِ گرمیوں کی ہے دل بہار لسی
یہ خوش گوار لسی، یہ ذائقے دار لسی!

تقریب کوئی بھی ہو چھوٹی ہو یا بڑی ہو
کھانوں کو بخشتی ہے سچا وقار لسی

مشروب تو بہت ہیں نام ان کے کیا گناؤں
سچ پوچھیے تو ان میں بااعتبار لسی

دنیا کی نعمتیں سب اپنی جگہ ہیں لیکن
مجھ کو ہے سب سے بڑھ کر جانِ بہار لسی

پیتا ہے شوق سے جو وہ خوش نصیب ٹھہرے
لاتی ہے اس کے منہ پر سچا نکھار لسی

گرمی کی سختیوں کا کچھ غم نہیں ہے طاہر
سب سختیوں میں میری غم گسار لسی

گلزار بنادیں گے

فاروق حسن پانڈیو

اگست کا مہینا تھا۔ آسمان کالے بادلوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہوا کے ٹھنڈے جھونکے شدید گرمی کی وجہ سے لوگوں کی جھلسی ہوئی جلد کو نئی جان بخش رہے تھے۔ اس سہانے موسم کا پرندوں پر بھی خوش گوار اثر پڑا تھا۔ وہ بہت سریلی آواز میں گاتے ہوئے منڈلا رہے تھے۔ طوطوں کی ٹیں ٹیں، چڑیوں کی چوں چوں اور کوئل کی کو کو کی آوازیں کانوں میں رس گھول رہی تھیں۔ گلیوں میں ننھے منے بچے اچھل کود رہے تھے۔ وہ اپنے معصوم قہقہوں سے ماحول کو اور بھی خوش گوار بنا رہے تھے۔ اس انتہائی اچھے موسم کو دیکھ کر شفاعت کی امی نے اس سے کہا "بیٹے! موسم بہت اچھا ہے۔ باہر نکل کر لطف اٹھاؤ.... اس طرح سارا سارا دن کمرے میں بیٹھے رہنے سے صحت خراب ہو سکتی ہے"۔

"امی جان! میں بہت سخت جان ہوں۔ مجھے کچھ نہیں ہو گا" شفاعت نے عجیب طرح سے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس مسکراہٹ میں شدید دکھ چھپا ہوا تھا۔ اس کی والدہ نے اس دکھ کو محسوس کر لیا اور خود بھی بہت دکھی ہو گئی۔ اگر وہ خود پر قابو نہ پاتی تو آنسو چھلک پڑتے مگر وہ بیٹے کے سامنے اپنا غم چھپانے کی کوشش کرتی تھی اور ہر طرح سے کوشش کرتی تھی کہ شفاعت اس غم کو بھول جائے۔ اس نے خود پر قابو پا کر کہا۔ "شفاعت بیٹے! تم چھت پر جا کر بیٹھو، میں تمہارے لیے چائے لے کر آتی ہوں"۔

شفاعت کا جی تو نہیں چاہ رہا تھا مگر والدہ کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے وہ چھت پر چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر شروع میں تو اس نے فرحت محسوس کی مگر پھر گلی سے بلند ہونے والے بچوں کے قہقہے سن کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اب فضا میں منڈلانے والے پرندے اسے ذبح خانے کے اوپر منڈلانے والے گدھ محسوس ہونے لگے اور گلی میں اچھل کود کرنے والے بچے سنپولیے۔ شفاعت نے بچوں کی طرف دیکھ کر مدھم آواز میں بڑبڑا کر کہا۔ "ہنسو، جی بھر کر ہنسو سنپولیو! آج کے دن جتنا ہنسنا چاہتے ہو ہنس لو۔ کل تم خون میں لت پت تڑپتے اور چیختے نظر آؤ گے.... اس وقت میں قہقہے لگاؤں گا اور تمہارے والدین دھاڑیں مار مار کر روئیں گے"۔

------ O ------

شفاعت اور ضمیر جڑواں بھائی تھے۔ ان کے والدین کسان تھے۔ وہ اپنی زمین پر فصلیں اگا کر اتنا کما لیتے تھے کہ آسانی سے نہ صرف خرچہ پورا ہوتا تھا بلکہ کچھ بچت بھی ہو جاتی تھی۔ ان کا والد محبوب علی خود تو صرف مڈل پاس تھا مگر شفاعت اور ضمیر کو اچھی تعلیم دلا کر بڑا آدمی بنانا چاہتا تھا۔ دونوں بھائیوں کو بھی پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ آٹھویں جماعت تک بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوتے آئے تھے۔ آٹھویں سے آگے گاؤں میں اسکول نہیں تھا۔ اب محبوب علی نے بچوں کی تعلیم کی خاطر زمین ہوارے پر ایک کسان کو دے دی۔ خود شہر میں ایک گھر لے کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ وہاں رہائش اختیار کر لی۔ اس نے دونوں بیٹوں کو ہائی اسکول میں داخلہ دلا دیا اور خود ایک دکان کرائے پر لے کر اجناس کا کاروبار شروع کر دیا۔

شفاعت اور ضمیر ہائی اسکول میں داخل ہونے پر بہت

تھے۔ دونوں بھائی پڑھائی کے معاملے میں تو ایک جیسے ذہین اور محنتی تھے مگر باقی معاملات میں دونوں کے مزاج میں بہت فرق تھا۔ شفاعت خوشامد پسند تھا۔ وہ امیر لڑکوں کو دوست بناتا تھا یا پھر ان کو جو اس کی خوشامد کریں۔ ضمیر ہر ایک سے محبت اور عزت سے پیش آتا تھا۔ وہ دوسروں کی خدمت کر کے بہت خوش ہوتا تھا۔ شفاعت کو ضمیر کی عادات اور مزاج اچھا نہیں لگتا تھا' خاص کر غریب لڑکوں سے اس کی دوستی۔ وہ چاہتا تھا کہ ضمیر بھی اسی کی طرح امیر لڑکوں سے دوستی کرے۔ کسی کی خدمت کرنے کے بجائے دوسروں سے خدمت کروائے۔ اس سلسلے میں دونوں بھائیوں میں کئی دفعہ بحث ہوئی تھی۔ ایک دفعہ یوں ہوا کہ ضمیر گھر پر ایک دوست کو لے آیا۔ ضمیر کے دوست کا حلیہ بہت خراب تھا۔ اس کے کپڑوں پر جگہ جگہ کالے تیل کے دھبے لگے ہوئے تھے اور پیروں میں پھٹے پرانے جوتے تھے۔ اسے اپنے گھر میں دیکھ کر شفاعت کو بہت برا لگا اور اپنے بھائی پر شدید غصہ آیا مگر وہ لڑکے کے چلے جانے تک خاموش ہی رہا۔ جب لڑکا چلا گیا تو شفاعت نے غصے بھرے لہجے میں کہا۔ "تم ایسے بدحال لڑکوں کو گھر میں کیوں لاتے ہو...؟ لوگ کیا سمجھیں گے کہ ہم بھی کوئی گرے پڑے لوگ ہیں...؟ وہ ہماری عزت کرنا ہی چھوڑ دیں گے...؟"

"عزت امیری یا غریبی میں نہیں... اچھے یا برے کردار سے ہوتی ہے۔ کیا ہمارے غریب رشتہ دار ہمیں ملنے نہیں آتے...؟" ضمیر نے پرسکون لہجے میں کہا۔

"رشتہ دار آتے ہیں... مگر یہ لڑکا ہمارا رشتہ دار نہیں...!"

"ہمارا رشتہ دار ہے... تم نہ مانو تو تمہاری مرضی!" ضمیر نے بھی تیز لہجے میں جواب دیا۔

"خوب! اب رشتہ داری بھی بن گئی... بھلا بتاؤ تو وہ تیرا کیا لگتا ہے...!!؟"

"اس سے میرے تین اور تمہارے دو رشتے ہیں... اس سے ایک تو ہم وطن ہونے کا رشتہ ہے... دوسرا ہم مذہب ہونے کا رشتہ ہے اور میرا اس سے تیسرا رشتہ استاد شاگرد کا ہے... وہ گودام میں کام کرتا ہے۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد باغیچے میں بیٹھ کر مجھ سے پڑھتا ہے...!" ضمیر نے انگلیوں پر رشتے گنوائے۔

"یہ رشتے تمہیں مبارک... مگر میرا وہ کچھ نہیں لگتا... اگر تم دوبارہ اسے گھر میں لائے تو بہت برا ہو گا" شفاعت نے تلخ لہجے میں کہا۔

"وہ آئے گا... یہ گھر صرف تیرا نہیں میرا بھی ہے!" ضمیر نے بھی بگڑ کر تیز لہجے میں کہا۔ اسی وقت والدہ نے وہاں پہنچ کر جھگڑا ختم کرایا ورنہ شاید نوبت لڑائی تک پہنچ جاتی۔

دونوں بھائیوں کا مزاج مختلف ہونے کے باوجود ان کی آپس میں بہت محبت تھی۔ اس لیے کچھ ہی دیر بعد دونوں اس تلخ کلامی پر شرمندہ ہو کر خود ہی ایک دوسرے کو منانے لگے۔

پھر ایک دن ایسا ہوا کہ شفاعت آدھی چھٹی کے وقت اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ اسکول کے باغیچے میں بیٹھا گپ شپ لگا رہا تھا۔ اسی وقت اس کے کانوں میں ایک نغمے کی آواز پڑی۔

"گل زار بنا دیں گے...!"

"اس دیس کو ہم گل زار بنا دیں گے"

شفاعت نے نظر اٹھا کر اس طرف دیکھا۔ لڑکوں کی ایک قطار ہاتھوں میں پودے لیے وہ نغمہ گاتے ہوئے جا رہی تھی۔ سب سے آگے اس کا بھائی ضمیر تھا۔ ان سب کے کپڑوں پر مٹی کے دھبے لگے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود شفاعت کو وہ منظر اور ان کی میٹھی آواز بہت اچھی لگ رہی تھی۔ وہ فوراً اٹھا اور دوڑ کر ان کے پاس پہنچا۔ وہاں پہنچ کر ضمیر سے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ ضمیر نے اسے بتایا کہ وہ شجر کاری کر کے اس دیس کو گل زار بنانے جا رہے ہیں۔ اس منظر سے متاثر تو وہ پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اب یہ بات سن کر شفاعت بھی ان کے ساتھ چل پڑا اور وہی گیت

ان کے ساتھ گانے لگا۔

اس دن تو شفاعت کے مزاج میں یہ اچھی تبدیلی آئی۔ مگر یہ تبدیلی زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکی۔ ایک دل و دماغ کو ہلا دینے والے حادثے نے شفاعت کو دوبارہ پہلے والا انسان بنا دیا۔ ہوا یہ کہ ایک دن شفاعت اور ضمیر خوش خوش اسکول سے گھر کی طرف جا رہے تھے۔ دونوں نویں جماعت کے امتحان میں اچھے نمبروں سے پاس ہوئے تھے۔ راستے میں ایک مٹھائی کی دکان پڑتی تھی۔ شفاعت نے ضمیر سے کہا کہ یہیں رکو میں دکان سے کچھ مٹھائی لے آؤں۔ وہ دراصل اپنے جیب خرچ سے اپنی امی اور ابو کو پاس ہونے کی خوشی میں مٹھائی کھلانا چاہتا تھا۔ شفاعت کے دکان میں جانے کے چند لمحوں بعد اچانک دھڑا دھڑ فائرنگ شروع ہو گئی۔ ضمیر نے بھاگ کر قریب ہی موجود شیشم کے درخت کی آڑ لے لی۔ لیکن تجسس کے مارے اس نے جھانک کر فائرنگ کی طرف دیکھا۔ فائرنگ ایک کار سے ہو رہی تھی۔ اس میں چار افراد تھے۔ وہ ہر نظر آنے والے پر فائرنگ کرتے جا رہے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ دہشت گرد ہیں۔ چاروں کے چہروں پر نقاب تھے لیکن عین اسی وقت ایک کے چہرے سے نقاب اتر گئی۔ ضمیر کو ایسا لگا کہ وہ پہلے بھی اسے کہیں دیکھ چکا ہے۔ مگر کہاں؟ یہ یاد نہیں۔ کچھ دیر بعد گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ تب ضمیر نے نظریں گھمائیں تو ہر طرف ٹہلتے ہوئے لوگ نظر آئے۔ وہ بے تحاشا مٹھائی کی دکان کی طرف دوڑ پڑا تاکہ دیکھ سکے کہ شفاعت خیریت سے ہے یا نہیں۔

دکان کے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے مگر خوش قسمتی سے شفاعت کو وہاں گولی نہیں لگی تھی۔ ضمیر کو جب بھائی کی طرف سے اطمینان ہوا تب شفاعت کو ساتھ لے کر تڑپتے ہوئے لوگوں کی طرف چل پڑا۔ دونوں بھائیوں نے اپنی اپنی قمیصیں پھاڑ کر زخمیوں کا خون بند کرنے کی کوشش کی۔ کچھ ہی دیر میں وہاں ایمبولینس اور پولیس کی گاڑیاں پہنچ گئیں' تب دونوں بھائیوں نے زخمیوں اور ہلاک ہونے والوں کو ایمبولنسوں میں منتقل کرانے میں پولیس کی مدد کی۔ جب تمام

بھی لے جائے گئے تب ضمیر نے ایک پولیس افیسر سے کہا کہ وہ ایک دہشت گرد کا چہرہ دیکھ چکا ہے اور وہ چہرہ اسے دیکھا بھالا محسوس ہوا تھا۔ لیکن یاد نہیں کہ کہاں دیکھا تھا۔

دوسرے دن کے اخبارات میں اس دہشت گردی کے واقعہ کی تفصیل میں ضمیر کا ذکر بھی تھا۔ اور ساتھ یہ بھی لکھا تھا کہ ہو سکتا ہے لڑکے کو کبھی بھی یاد آجائے کہ وہ دیکھا بھالا چہرہ کس کا تھا۔

خبر چھپنے کے دوسرے دن ضمیر، شفاعت اور محلے کے دوسرے لڑکے اسکول سے چھٹی ہونے کے بعد پیدل ہی واپس اپنے گھروں کو جا رہے تھے۔ جب لڑکے اپنے محلے میں پہنچے تو اچانک دو کاریں ان کے قریب آکر رکیں۔ ان میں سے آٹھ افراد نے اتر کر تمام لڑکوں کو گھیرے میں لے لیا۔ ان کے چہروں پر نقاب تھے اور ہاتھوں میں رائفلیں۔ انہوں نے رائفلیں سیدھی کر کے کہا "بتاؤ..... ضمیر کون ہے.....؟ نہیں بتاؤ گے تو سب کو.....!"

لڑکے خوف زدہ ہو کر لرز رہے تھے۔ خوف کے باوجود کسی نے ضمیر کے بارے میں نہ بتایا۔

"بتاؤ ورنہ موت کے لیے تیار ہو جاؤ.....!" ایک غنڈے نے گرج کر کہا۔

"ضمیر، تمہارے ساتھ نہیں ہے.....!" شفاعت نے لرزتے ہوئے کہا۔

محلے کے لوگ کھڑکیوں سے جھانک رہے تھے۔ ایک رائفل بردار نے محلے داروں کو مخاطب کر کے کہا "لوگو.....! اگر اپنے بچوں کی زندگی چاہتے ہو تو بتاؤ ان لڑکوں میں ضمیر کون ہے.....؟"

"وہ لمبے قد والا.....!" کسی نے اپنا چہرہ ظاہر کیے بغیر بتایا۔

"کون سا لمبے قد والا؟ یہاں تو دو لمبے ہیں"۔

"وہ، جس کا سرخ رنگ کا بستہ ہے....." دوسری طرف سے کسی عورت کی آواز سنائی دی۔ اس نے بھی اپنے آپ کو ظاہر کیے بغیر آواز لگائی تھی۔

آواز سنتے ہی رائفل برداروں نے ضمیر کو پکڑ کر کار میں پھینکا پھر چند لمحوں میں کاریں اسٹارٹ ہو کر چلی گئیں۔ شفاعت چیخ چیخ کر لوگوں کو مدد کے لیے پکارنے لگا مگر کسی نے کچھ نہیں کیا۔ کسی میں اتنی جرات بھی نہیں تھی کہ آگے بڑھ کر اس کو تسلی دیتا۔ اس کا گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ پچھلی ہی گلی میں تھا۔ اس کا والد محبوب تو دکان پر گیا ہوا تھا۔ البتہ والدہ گھر پر تھی۔ اس کے کانوں میں اپنے بیٹے کی چیخوں کی آواز پڑ گئی۔ وہ دوڑی ہوئی وہاں پہنچی۔ وہ دور سے ہی "کیا ہوا..... کیا ہوا....." کی صدائیں لگاتی اپنے بیٹے کی طرف آرہی تھی۔ ماں کو دیکھ کر شفاعت نے چیخ چیخ کر کہنا شروع کیا "ضمیر کو دہشت گرد لے گئے....."

یہ الفاظ والدہ پر بجلی بن کر گرے اور وہ دھڑام سے نیچے گر کر بے ہوش ہو گئی۔ اسے گرتا دیکھ کر کچھ عورتوں نے آگے آکر اسے اٹھایا اور قریب کے گھر میں لے گئیں۔ ایک بزرگ نے شفاعت کو آکر تسلی دی اور اسے والدہ کے پاس لے گیا۔ اسی بزرگ نے ایک نوجوان سے کہا کہ محبوب کی دکان پر جا کر اسے اطلاع دے اور دوسرے نوجوان سے کہا کہ پولیس کو فون کر کے اطلاع دے۔ کچھ ہی دیر بعد پولیس اور ضمیر کا والد محبوب وہاں پہنچ گئے۔ ضمیر کی والدہ بھی ہوش میں آگئی تھیں۔ پولیس کو شفاعت کے علاوہ کسی نے کچھ نہیں بتایا۔ وہ سب دہشت گردوں سے خوف زدہ تھے۔ پولیس ضمیر کے والدین اور شفاعت کو تسلی دے کر چلی گئی۔ لیکن شام کو ضمیر کی لاش ایک ویران سڑک پر پڑی ملی۔

اس واقعہ نے شفاعت اور اس کے والدین کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ بڑوں نے تو بے بسی کی وجہ سے رو دھو کر خاموشی اختیار کر لی تھی لیکن شفاعت کھلے عام کہنے لگا تھا کہ وہ غنڈوں کو تلاش کر کے بھائی کے قتل کا بدلہ لے گا۔ ساتھ ہی وہ کہتا تھا کہ محلے دار بھی اس کے بھائی کے قاتل ہیں۔ ان میں سے ہی کچھ نا معلوم افراد نے غنڈوں کو آواز دے کر بتایا تھا کہ ضمیر کون ہے۔ انہوں نے اپنے بچوں کو

بچانے کے لیے بہادری کا کوئی قدم اٹھانے کے بجائے ضمیر کی نشان دہی کی تھی۔ اب اس نے کسی محلے دار بچے یا بڑے سے سیدھے منہ بات کرنا بھی چھوڑ دیا۔ اسے سب سے نفرت ہو گئی تھی۔ اسکول میں بھی وہ چپ رہتا تھا۔ صرف ایک لڑکے عامر سے اس کی دوستی رہ گئی تھی۔ وہ بھی اس لیے کہ اس نے شفاعت سے کہا تھا کہ وہ دہشت گردوں سے انتقام لینے میں اس کی مدد کرے گا۔ عامر نے اسے بتایا تھا کہ اس کا بھائی ایک طاقت ور تنظیم کا سرگرم رکن ہے۔ وہ معلوم کر کے بتائے گا کہ ضمیر کے قاتل کون ہیں۔ اس نے شفاعت سے راز داری کا حلف بھی لیا تھا۔

کچھ دنوں بعد عامر نے اسے اپنے بھائی تنویر سے ملاقات کروائی اور اسے پورے حالات بھی بتائے۔ تنویر نے شفاعت کو اپنی تنظیم کا ممبر بن جانے کا مشورہ دیا جو اس نے قبول کر لیا۔ اب وہ حقوق غربا تنظیم کا ممبر بن گیا تھا۔ وہ تنظیم کے لیے دیواروں پر چاکنگ کرتا تھا اور تنظیم کی تشہیر کے ایسے ہی دوسرے کام کرتا تھا۔

کچھ عرصے بعد تنظیم کا ایک خفیہ اجلاس ہوا۔ سب سے پہلے تو ایک لیڈر نے شفاعت کو بتایا کہ اس کے بھائی کو بھارتی ایجنٹوں کی تنظیم "ایرا" کے دہشت گردوں نے قتل کیا تھا اور معلوم ہوا ہے کہ تمہارے محلے میں بھی اس تنظیم کے کارکن موجود ہیں۔ انہوں نے ہی آواز دے کر اپنے دہشت گرد دوستوں کو بتایا تھا کہ کون لڑکا ضمیر ہے۔ وہ لیڈر کچھ دیر خاموش ہوا پھر کہنے لگا۔ "حکومت ہمیں کم زور سمجھ کر ہماری تنظیم حقوق غربا کے مطالبے نہیں مانتی۔ اس لیے ہم اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں ہو کہ ضروری ہو گیا ہے۔ اس سلسلے میں ہم 14 اگست کو ہونے والے جشن آزادی کے کچھ جلسوں میں ریموٹ کنٹرول بم بلاسٹ کروانا چاہتے ہیں۔ تمہارے محلے میں بھی ایک جلسہ ہو گا' جہاں زیادہ تر بچے ہی شریک ہوں گے... تم وہاں ریموٹ کنٹرول کے ذریعے بم بلاسٹ کرو گے۔ وہاں تمہارے محلے کے "ایرا" تنظیم" کے کارکنوں کے بچے بھی مریں گے۔ اس طرح حقوق غربا تنظیم کی طاقت کا مظاہرہ بھی ہو گا اور تمہارے بھائی کے قاتلوں سے بدلہ بھی لیا جا سکے گا...!

شفاعت تو انتقام کے جذبے میں اندھا ہو چکا تھا۔ اس لیے فوراً حامی بھر لی۔ ویسے بھی وہ اپنے محلے والوں کو اپنے بھائی کے قاتلوں میں پہلے ہی ملوث سمجھتا تھا۔ وہ بم اور ریموٹ کنٹرول لے کر وہاں سے گھر چلا گیا۔ اس دن اگست کی بارہ تاریخ تھی۔

اگلے دن یعنی 13 اگست کو موسم اچانک خوش گوار ہو گیا لیکن شفاعت کے اندر کا موسم انتہائی خراب ہو چکا تھا۔ وہ چھت پر بیٹھا ہوا تصور ہی تصور میں محلے کے

بچوں کو خون میں لت پت تڑپتا دیکھ کر لذت محسوس کر رہا تھا۔ وہ انہی خیالوں میں بڑبڑائے جا رہا تھا کہ اچانک کچھ دور سے اسے ایک نغمے کی آواز سنائی دی۔

"گل زار بنادیں گے

اس دیس کو ہم گل زار بنادیں گے"

اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نے آواز کی سمت دیکھا۔ دس بارہ بچے ہاتھوں میں پودے لیے باغیچے کی طرف جا رہے تھے۔ شفاعت کو اپنا بھائی ضمیر یاد آگیا۔ 6 ماہ پہلے وہ بھی اسی طرح گیت گاتا ہوا شجر کاری کرنے جا رہا تھا۔ اسے ایسا لگا کہ ضمیر ہی اپنے ساتھیوں کے ساتھ وطن کو گل زار بنانے جا رہا ہے۔ شفاعت کا مثبت جذبہ سر ابھارنے لگا۔ اسے خیال آیا کہ کیا کل وہ ان وطن کو گل زار کرنے والے بچوں کو بھی بم سے ہلاک کر دے گا۔ ایسا کیا تو اس کے بھائی کے قاتل دہشت گردوں اور اس میں کیا فرق رہ جائے گا۔ انہوں نے وطن کو گل زار کرنے والے اس کے بھائی کو مارا تھا اور وہ وطن کو گل زار کرنے والے کئی معصوموں کا قاتل بن جائے گا۔ اس سوچ نے اچانک ایک اور سوچ کو اس کے ذہن میں پیدا کیا۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ حقوق غربا والے ہی اس کے بھائی کے قاتل ہوں... وہ بھی دہشت گرد ہی ہیں۔ جبھی تو جشن آزادی کے جلسوں میں بم بلاسٹ کرانا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگ تو وطن دشمن ہوتے ہیں"۔ اس خیال نے شفاعت کے ذہن میں موجود انتقامی جذبے کے اندھیرے کو روشنی میں بدل دیا۔ اس نے عزم کیا کہ وہ دہشت گردوں کے عزائم کو ناکام بنا دے گا اور ان کو پکڑوا کر حب الوطنی کا ثبوت دے گا۔ وہ فوراً اٹھا۔ نیچے اترا۔ اب اس کے قدم ایس پی آفس کی طرف اٹھ رہے تھے۔ وہاں جا کر اس نے ایس پی کو پوری روئداد سنانے کے بعد بم اور ریموٹ کنٹرول کے اس کے گھر میں پڑے ہونے کا بتایا۔ ایس پی نے سادہ کپڑوں میں پولیس کو شفاعت کے ساتھ بھیج کر یہ چیزیں اس کے گھر سے منگوا لیں۔ پھر ایس پی نے فوراً آپریشن کی تیاری کی اور طوفانی رفتار سے چھاپہ مار کر تنویر کو گرفتار کر لیا۔ اسے مار پیٹ کر باقی ارکان اور اصل لیڈر کا پتا معلوم کیا۔ اس کے بعد وہاں چھاپے مار کر لیڈر اور دوسرے ارکان کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان سے بہت سے بم اور دوسرا جدید خود کار اسلحہ برآمد کر لیا۔ مزید تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ حقوق غربا تنظیم بھی "ایرا" کی ہی شاخ ہے۔ ضمیر کو بھی انہوں نے ہی قتل کیا تھا۔

تفتیش مکمل ہونے تک شفاعت کو اس کی حفاظت کے خیال سے حوالات میں رکھا گیا۔ وہاں پر وہ گن گنائے جا رہا تھا

"گل زار بنادیں گے...

اس دیس کو ہم گل زار بنادیں گے..."

اسی وقت ایس پی وہاں پہنچا اور اس نے کہا "اچھے بچے... واقعی اس ملک کو آج کے بچے ہی اعلی صلاحیتیں حاصل کر کے گل زار بنا سکتے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ کوئی جرم کرنے سے پہلے ہی تم نیکی کی راہ پر لوٹ آئے ہو۔ دہشت گردوں کو پکڑوانے کے کارنامے پر تمہیں حکومت کی طرف سے ایوارڈ دینے کا اعلان ہوا ہے اور تمہیں مکمل تحفظ فراہم کرنے کا بندوبست بھی کر دیا گیا ہے"۔

بلا عنوان

اس کارٹون کا اچھا سا عنوان تجویز کیجئے اور 500 روپے کی کتابیں جیتے۔
عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 7 اگست 1999ء

جولائی 1999ء کے بلا عنوان کارٹون کے بے شمار عنوان موصول ہوئے۔ ان میں جج صاحبان کو مندرجہ ذیل 6 عنوان پسند آئے۔ جن ساتھیوں نے یہ عنوان تجویز کئے ان میں سے یہ 6 ساتھی بذریعہ قرعہ اندازی انعام کے حق دار قرار پائے۔

- پہلا انعام: رضا طارق اسلام آباد (ابوجی، آپ میری بائی سکل بھی خراب کر دیں گے، 100 روپے کی کتابیں)
- دوسرا انعام: عفت ضیا رحیم یار خاں (جوش میں ہوش کہاں، 95 روپے کی کتابیں)
- تیسرا انعام: محمد واجد عباس ساہی وال (قسمت پھوٹی، بائی سکل ٹوٹی، 90 روپے کی کتابیں)
- چوتھا انعام: مریم اکرم لاہور (اپنی تو توڑی ہے میری بھی توڑو گے، 80 روپے کی کتابیں)
- پانچواں انعام: سید افشاں رحیم یار خاں (بائی سکل دے دو، انعام آدھا آدھا، 75 روپے کی کتابیں)
- چھٹا انعام: امجد محمود، بہاول نگر (ہارتے ہو تو ہارو میں اپنی بائی سکل نہیں دوں گا، 60 روپے کی کتابیں)

فیروز سنز کی
گفٹ بُکس
GIFT BOOKS

خوشی کے موقع پر
اپنے عزیزوں اور دوستوں کو
یہ خوبصورت اور رنگین
کتابیں تحفے میں دیجیے!

FEROZSONS (PVT.) LTD.
LAHORE–KARACHI–RAWALPINDI

The Taleem-o-Tarbiat, Lahore

NO. CPL. 32 PAKISTAN'S MOST WIDELY READ URDU MAGAZINE FOR CHILDREN OF ALL AGES Price Rs. 15.00

بچّوں کا اِنسائیکلوپیڈیا

۷۹۶ دل کش رنگین تصویریں

دُنیا بھر کی معلومات

یہ خُوب صُورت اِنسائیکلوپیڈیا فیروز سنز لمیٹڈ نے لندن کے ایک ناشر کے اشتراک سے شائع کیا ہے۔ پاکستان میں بچّوں کے لیے اس پائے کی کتاب آج تک نہیں چھپی۔

کائنات، نظامِ شمسی، زمین پر زندگی کی ابتدا، قسم قسم کے جانور، پھل، پھول اور پودے، قدرت کے عجوبے، اہم ایجادات، نام ور لوگ —— ان کے علاوہ اور دُوسرے بہت سے موضوعات۔

اپنے شہر کے تاجرانِ کتب سے خریدیے

FEROZSONS (PVT.) LTD.

LAHORE – KARACHI – RAWALPINDI

خوشی کے موقع پر اپنے عزیزوں اور دوستوں کو خوبصورت اور رنگین کتابیں تحفے میں دیجیے!

فیروز سنز کی

گِفٹ بُکس

GIFT BOOKS